

سمن پوش

مجنوں گورکھپوری

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصّہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
(میر حسنؔ)

سمن پوش

اور

دوسرے افسانے

جن کا تعلّق رُوحانیّات سے ہے

از

مجنوں گورکھپوری

کتب خانہ علم و ادب دہلی

طبع دوم سنہ ۱۹۴۳ء قیمت ۸/

انتساب

ادب چہ چارہ کند شوق چوں فضول افتد
بجائے عذر دل آوردہ ام قبول افتد

میں اپنے اس مختصر سے مجموعہ کو انتہائے خلوص کے ساتھ اپنے مہربان دوست میاں صاحب سیّد جوّاد علی شاہ رئیس امام باڑہ گورکھپور کے نام معنون کرتا ہوں جو "ایوان اشاعت" کے قیام سے لیکر اس وقت تک میری تمام ادبی "پریشاں خوابیوں" میں نہایت بلند حوصلگی اور فراخ دلی کے ساتھ میرے دمساز رہے، اور اس طرح نہ صرف اپنی علم پروری اور ادب نوازی کا حق ادا کرتے رہے بلکہ وضع دوستی بھی خوب نباہتے رہے۔

"مجنوں"

فہرست

نگاہ بازگشت

("سمن پوش" دوسری بار)

(۱)

شدیم خاک ولیکن زبوئے تربت ما
تواں شناخت کزایں خاک مردمی خیزد

(فیضی)

میرے اِن افسانوں کے مجموعے کو کتابی صورت میں پہلی مرتبہ چھپے ہوئے پورے آٹھ سال ہوگئے اور اِن افسانوں کو لکھے ہوئے پندرہ سولہ سال ہو چکے ہیں۔ صرف چار افسانے یعنی "محبت کا جوگ" اور "سبز پری" اور "تمہیدی مقالے" اور "دنیائے آب و گل سے دور" کو لکھے ہوئے تیرہ سال ہوئے ہیں۔ یہ مدت کچھ معلوم نہیں ہوتی اگر محض ہندسہ کا شمار کیا جائے۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایک دہائی اور دوسری دہائی میں داخلی اور خارجی۔ ذاتی اور سماجی۔ نظری اور عملی اعتبار سے جو فرق پیدا ہو جاتا ہے خاصکر ایسے بحرانی اور ہیجانی دور میں جس سے ہماری دنیا پچھلے پچیس تیس سال سے گذر رہی ہے مگر کسی طرح گذر نہیں چکتی اس کو دیکھتے ہوئے ہم اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ اتنے کم برسوں کی مدت کو ایک اہم مسافت سمجھیں۔ ابتو ہر دس سال دنیا کی رفتار میں ایک نئی منزل کا حکم رکھتا ہے۔

ماضی کی یاد خطروں اور آزمائشوں سے خالی نہیں ہوتی۔ بالخصوص اُس وقت جبکہ انسان حال سے آسودہ اور مطمئن نہ ہو۔ اقبال کا شعر ہے:۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینہ میں غمِ منزل نہ بن جائے

اِسی لئے گزرے ہوئے زمانہ کو مڑ کر دیکھتے ہوئے میں بہت چوکنّا رہتا ہوں۔ کہ کہیں اِسی میں کھو کر نہ رہ جاؤں۔ مگر ماضی سے انکار کر دینا یا اُس کو محض حرفِ غلط سمجھ لینا بھی کوئی صحیح اور معقول میلان نہیں ہے۔ اگر زمانہ کے صحیح احساس اور تواریخی تخیل کے ساتھ ماضی پر نظر ڈالی جائے تو اس سے نئی بصیرتیں پیدا ہوتی ہیں جو حال کی تہذیب و تحسین اور مستقبل کی تعمیر و تکمیل میں کام آسکتی ہیں۔

آج مجھ کو بہرحال گذرے ہوئے زمانے اور گذری ہوئی باتوں پر بازگشت نظر ڈالنا ہے۔ میرے افسانے ایک خاص دور اور ایک خاص میلان کی نمایندگی کرتے ہیں جس سے دنیا آگے بڑھ گئی ہے۔ اب سے بیس پچیس سال پہلے نہ صرف افسانے میں بلکہ اردو ادب کی ہر صنف میں جو رجحان غالب تھا وہ رومانیت (ROMANTICISUN) اور انفرادیت کا رجحان تھا اور یہ یقیناً اس رومانی واقعیت (ROMANTIC REALISUN) اور جذباتی نفسانیت (ENOTIONAL PSYCHOLOGISN) کا نتیجہ تھا جو اس وقت مغربی ادب کے ہر شعبہ میں رائج تھی اور جو اب بھی بھیس بدل بدل کر اور نئے میلانات کے ساتھ مخلوط ہو کر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ آج جس نئی تحریک کا نام اشتراکی واقعیت (SO IALIST REALISUN) ہے اور جو یقیناً دنیائے انسانیت کا ایک اہم تاریخی اکتساب ہے اس کے ادبی شہ پاروں میں بھی اس رومانیت کے عناصر گھلے ملے پائے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس رومانیت سے دنیا اکدم خالی کبھی نہیں ہوگی۔ بغاوت

اور انقلاب میں بھی اس کی ایک کسر باقی رہے گی جس کو غیر ضروری یا فضول نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ادب میں اس رومانیت کی لَے حد سے آگے بڑھ گئی تھی اور اس کے خلاف ایک ردِ عمل کی ضرورت تھی جو ہو کر رہا۔ ہم کو یہ دیکھ کر بڑی تشفی ہوتی ہے کہ اب سے پندرہ بیس سال پہلے تک ہماری شاعری اور فسانہ نگاری میں سماجی شعور اور زندگی کے مادی اور خارجی مرکز کے احساس کی جو کمی تھی وہ دھیرے دھیرے پوری ہو رہی ہے اور ہمارے شاعر اور ادیب اپنی ذات اور اپنے نفس کی تاریک بھول بھلیاں سے نکل کر باہر کی صاف اور صحت بخش روشنی میں آ گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی آنکھیں اتنی چکا چوندیں ہیں کہ اکثر ان کو چیزیں اپنے صحیح حلیہ میں نظر نہیں آتیں۔ بہر حال اس وقت ہم پندار اور اطمینان کے ساتھ اردو ادب کے متعلق عام طور سے یہ کہہ سکتے ہیں:۔

گلشن امروز بہ رنگے و نوائے دگر است
باغ را تازہ تر آبے و ہوائے دگر است

(۲)

میرے افسانے رومانی مدرسہ کی چیزیں ہیں اور ان کا تعلق نفسیاتی انفرادیت (PSYCHOLOGICAL INDIYIDUAIISUN) سے ہے میں نے اب تک جتنے افسانے لکھے ہیں سب کا تعلق بظاہر محبت سے ہے۔ لیکن اگر غور سے پڑھا جائے تو رومانیت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ میرے افسانوں میں فکر و تامل کا ایک میلان ضرور ملے گا جو غالب اور حاوی ہوگا۔

افراد کی زندگی پر خارجی اسباب و عوارض کس طرح اور کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو انکے اپنے ذاتی داعیات و محرکات کیسے بناتے بگاڑتے ہیں؟

یہ سوال اب سے چند سال پیشتر میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور میں افراد کی شخصی قدر اور اُس کے مقصد اور مقدر کے مسئلہ پر دن رات غور کیا کرتا تھا اور اس سلسلہ میں مجھے انسان کا جذبۂ عشق ایک عجیب خطرہ نظر آتا تھا۔ میں اپنے محسوسات اور افکار کو افسانے کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ یہ محض اتفاقی بات تھی۔ اگر میں افسانے نہ بھی لکھتا تو بھی کسی نہ کسی شکل میں میرے یہ خیالات ظاہر ہوتے۔

یہ پانچ افسانے میرے اور افسانوں سے مختلف ہیں۔ مرکزی تصور اور بنیادی میلان تو ان میں بھی وہی ہے جو میرے اور افسانوں میں ہے۔ لیکن ان میں فضا اور پس منظر بدلا ہوا ہے۔ ان افسانوں کا تعلق اس قیاسی اور فرضی دنیا سے ہے جس کا نام عالم ارواح رکھا گیا ہے۔ میں نے ایسے صرف پانچ افسانے لکھے ہیں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان سے میرے متعلق ایک دلچسپ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور بعض حلقوں میں اب بھی ہے اس زمانے میں میرے پاس متعدد ایسی تحریریں آئیں اور اب بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں جن میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا واقعی عالم ارواح کا کہیں وجود ہے اور کیا اس سے اور ہماری دنیا سے سلسلۂ مراسلات قائم کیا جا سکتا ہے۔ میرے لئے یہ تحریریں عبرت سے خالی نہیں ہوتیں۔ میں نے فرداً فرداً ان لوگوں کو یاد نہیں کیا جواب دیئے ہیں۔ لیکن آج ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عنوان کی جتنی غلط فہمیاں ہوں اُن کو دور کردوں۔ عالم ارواح کے وجود و عدم کے سوال سے نہ مجھے اُس وقت بحث تھی اور نہ اب ہے اور روحانیات کے ساتھ مجھے کبھی بھی پیشہ ورانہ دلچسپی نہیں رہی۔ پھر میں نے ایسے افسانے کیوں لکھے؟ اس کے کئی اسباب تھے۔ میں دوسرے موقعوں پر اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ

مطالعہ میری زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور میرے لئے افیوں کے قسم کی چیز رہی ہے۔ بہت کم ایسے مسائل ومباحث ہوں گے جن کا میں نے کم سے کم کتابی مطالعہ نہ کیا ہو اور دنیا کے بہت کم مصنف ایسے ہوں گے جن سے میں نے کچھ نہ کچھ بصیرت نہ حاصل کی ہو۔

خندہ از گل، گریہ از ابر بہار آموختم
من ز ہر صاحبدلے یک شمہ کار آموختم

یہ پانچ افسانے جس زمانے میں لکھے گئے اُس زمانے میں کئی سال تک روحانیاتی تحقیقات اور نفسیاتی تحت الشعور کا مطالعہ کر چکا تھا اور ان مسائل پر جس قدر مستند علمی کتابیں اور مقالے نکل چکے تھے قریب قریب سب میری نظر سے گزر چکے تھے۔ اس مطالعہ سے میرے تخیل کو تحریک ہوئی اور میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر عالم ارواح کے ماورائی وجود کو تسلیم کر لیا جائے اور اگر مرنے کے بعد کی زندگی اسی قدر یقینی ہے جس قدر کہ یہ زندگی تو اس میں انسان کی فردیت کا کیا مستقبل ہے اور ہماری اس زندگی کے میلانات ومحرکات کا مقدر کیا ہوگا اور خاصکر ہمارے جذبۂ جنسی کا کیا حشر ہوگا جو بھوت کی طرح ہم سے لپٹا رہتا ہے؟ تخیل اور قیاس نے مجھے یہ بتایا کہ اگر کوئی ایسی دنیا اِس دنیا کے بعد ہے جہاں ہم کو رہنا ہے تو ہمارا وجود یقیناً اس دنیا کے وجود سے مربوط اور مسلسل رہے گا۔ اور اس حالت میں ہمارے ناآسودہ جذبات اور مجبور وناکام میلانات ایک مرتبہ پھر اُبھریں گے اور ہم کو ستائیں گے۔ مگر یہ سب تو قیاس آرائی تھی اور اس کی ساری بنیاد مطالعہ اور تخیل پر تھی۔

اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں نے جو کچھ اب تک لکھا ہے اب اس کی تردید کرنا چاہتا ہوں۔ یا جن مسائل پر میں پہلے سوچا کرتا تھا ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب ان سے زیادہ اہم اور سنگین مسائل ہیں جن کو پہلے حل کرنا ہے۔ ہم کو اپنی زمین کے کاروبار کو سدھارنے سے پہلے آسمان پروازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے :۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

زمین کے ہنگامے فرو اور سہل ہولیں تو آسمانی حقیقتیں بھی اس قابل ہیں کہ اُن پر غور کیا جائے اور اُن پر عبور حاصل کیا جائے۔ انسانیت اپنا بگڑا ہوا جسم پہلے سنوارلے تو روح کے آرام و تکلیف کا سوال اٹھائے۔ اسی لئے میرا خیال ہے کہ اِس وقت دنیا کو ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہماری سادگی اور واقعاتی زندگی کی فلاح و ترقی میں مدد دے۔

میں خود اب افسانے نہیں لکھتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو مجھے فی الحال اتنی فرصت اور فراغت میسر نہیں کہ بیٹھ کر کسی افسانے کی تشکیل کروں۔ دوسرے میں جیسے افسانے اب لکھنا چاہتا ہوں اُن کے لئے خارجی اسباب و حالات ابھی تیار معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن اب اردو میں کیسے افسانے لکھے جائیں؟ اس کی ایک نہایت واضح تخئیل میرے ذہن میں موجود ہے اور نئے میلانات کے جتنے افسانے اِس وقت لکھے جارہے ہیں باوجود اس کے کہ بہت کافی حد تک کامیاب ہوتے ہیں لیکن میری تخئیل سے کسی نہ کسی اعتبار سے الگ ہوتے ہیں۔ اگر زندگی رہی اور فرصت و اطمینان کے لمحے میسر ہوگئے اور پھر اگر حالات و عوارض نے اجازت دی تو بہت ممکن ہے میں پھر افسانے لکھوں اور اپنی نئی

تخئیل کو پیش کرنے کی کوشش کروں۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

(۴)

دوسری اشاعت کے لئے جو کچھ اس مجموعہ میں شامل ہے اس پر پوری نظر ثانی کی گئی ہے اور جا بجا عبارت میں کافی حذف و ترمیم کی گئی جس کی میں نے ضرورت محسوس کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک میرا وہ مضمون بھی شامل ہے جو ستمبر ۱۹۳۴ء کے "ایوان" میں مجھے لکھنا پڑا تھا۔ اِن افسانوں کا مجموعہ جب ۱۹۳۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تو "گریز" یعنے تمہید کے آخری حصہ نے کچھ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا اور اسی سلسلہ میں بریلی سے ایک صاحب نے مجھے خواہ مخواہ کی جھڑکی دی تھی۔ اس کا جواب میں نے ایوان میں "افسانہ کا افسانہ" کے عنوان سے دیا تھا۔

بہرحال اسی مجموعہ کی دوسری اشاعت کو پہلی اشاعت سے آپ کچھ بدلی ہوئی پائیں گے۔ اور امید ہے یہ تبدیلیاں اگر خوشگوار نہ ہوں گی تو ناگوار بھی نہ ہوں گی۔

"مجنوں گورکھپوری"

امام باڑہ
گورکھپور
۲۳۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

افسانہ کا افسانہ

دوش بر سوز دل و سینہ براتم دادند
سرِ چو شمع ببریدند و حیاتم دادند

میں جس وقت اپنے افسانوں کے نئے مجموعہ "سمن پوش" کے لئے "گریز" کے عنوان سے دیباچہ لکھ رہا تھا تو لکھتے لکھتے جب میں پانچویں یعنی آخری حصہ پر آیا تو میرا قلم خود بخود رکنے لگا۔ اور ایک سے زائد مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اس ذکر کو نہ چھیڑوں۔ نہ صرف اس لئے کہ اس کو میں ایک "حرفِ نازک" سمجھتا تھا بلکہ اس کو معرضِ بیان میں لاتے ہوئے میرے اندر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں میرے پڑھنے والے (جو اس اندوہناک خبر سے اسی قدر واقف ہیں جس قدر کہ میں خود) مجھے ایک بے حس جانور نہ سمجھیں، میں نے اس واقعہ کا نہایت مختصر ذکر کر دیا، اتنا ہی مختصر جتنا کہ ایک دل دکھا دینے والی بات کو ہونا چاہئے۔

لکھتے وقت میرے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ اس سے کہیں کسی قسم کی غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن آج بریلی سے ایک لفافہ ملا جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ تحریر شروع سے آخر تک نہایت افسوسناک غلط فہمیوں کا آئینہ ہے۔ لکھنے والے نے نہ تو اپنا اصلی نام بتایا ہے اور نہ اپنا پورا پتہ دیا ہے۔ اس کے صرف دو معنے ہو سکتے ہیں۔ یا تو مرسل یہ چاہتا ہے کہ میں اس کا جواب "ایوان" میں شائع کر کے عوام کے سامنے پیش کروں۔ یا وہ سرے سے ہی مجھے

کوئی جواب دینے کا موقع دینا ہی نہیں چاہتا۔ بہرحال اُس کا جو مقصد بھی رہا ہو میں اس خط کو مع اپنے جواب کے "ایوان" میں اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ اگر "سمن پوش" کا گریز پڑھ کر دوسروں کے دل میں بھی اسی طرح کوئی غلط خیال پیدا ہو گیا ہو تو وہ اس کی صحت کرلے۔ خط ذیل میں من وعن نقل کر دیا گیا ہے :-

"بریلی - ۴ - ۲ - اگست ۱۹۳۷ء

مجنوں صاحب!

غریب شفقت آپ کے افسانہ "سمن پوش" پر تصدق ہو جائے اور آپ بجائے "دعائے مغفرت" کے اس کے اس ایثار کو محض افترا پردازی پر محمول کریں۔ بڑے غضب کی بات ہے۔ مدیر نگار سے درپردہ مخالفت و مخاصمت کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ سرے سے واقعہ اور حقیقت تک سے انکار کر جائیں۔ یقین مانئے کہ آپ کی یہ "احسان فراموشی" "کفر" کے مرادف ہے۔ "ایوان" (جولائی[1] ۱۹۳۷ء) کے "اداریہ" اور "سمن پوش" کے "گریز" میں یہ پڑھ کر کہ آپ اس کو نیاز صاحب کی "اُپج" تصور فرماتے ہیں لوگوں کو سخت صدمہ ہوا۔ کاش آپ بریلی آتے تو میں آپ کو دکھلاتا کہ متصل ریلوے اسٹیشن عقب دھرم شالہ لالہ کنھئی لال جو بلند و بالا جدید قبر تیار ہوئی ہے وہ اسی غریب شفقت کی قبر ہے جس پر "شہید سمن پوش" کا کتبہ آنے جانے والوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ کر دو دو آنسو نچھاور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے ـــــ مجنوں صاحب! تم سلامت مرنے والے مر گئے"۔

"طور"

[1] جولائی نہیں اگست ۱۹۳۷ء کے ایوان میں میں نے اس حادثہ کا ذکر کیا تھا۔ مجنوں

"طور" صاحب مخلوط مغالطوں میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست" سب سے پہلے میں اس غلط فہمی کو لیتا ہوں جو میرے اور نیاز صاحب کے دیرینہ تعلقات کے باب میں ہے، اس لئے کہ میں اس بحث کو جلد ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنے والے نے میری کس تحریر سے یہ پتہ لگایا اور کیسے کہ نیاز صاحب کے ساتھ مجھے "درپردہ مخالفت و مخاصمت" ہے۔ بر سبیل تذکرہ "گریز" میں رسالہ "جن" اور اس کی شان نزول کا قصہ چھڑ گیا تھا لیکن وہ اس طور سے کہ

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

اس میں تو کوئی "سخن گسترانہ بات" بھی نہیں تھی۔ جس سے کوئی یہ نتیجہ نکالتا کہ نیاز صاحب کے ساتھ خدانخواستہ مجھے کوئی چشمک ہے۔ میں نیاز صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ آئیں اور طور صاحب کے اس "ظن بلیغ" کو دور کرنے میں میری مدد کریں۔ خاصکر اس لئے کہ دنیا اب تک اس کے برعکس سمجھتی رہی ہے، اور ایک حد تک بجا سمجھتی رہی ہے۔ نیاز صاحب کو ان کے مذہبیات سے الگ کر دیجئے جس کی میرے خیال میں دنیا کو کوئی ضرورت نہیں اور آپ مجھ کو نیاز صاحب سے بہت سی باتوں میں متفق پائیں گے۔ وہ تو میرے اُن مہربان دوستوں میں سے ہیں جن سے ناممکن ہے کہ لکھنؤ جاؤں اور نہ ملوں، بلکہ یوں سمجھئے کہ لکھنؤ میں اب یہی ایک ایسے شخص رہ گئے ہیں جن سے ملنے کو جی چاہتا ہے اور جن سے میں ملتا ہوں۔

"سمن پوش" کے "گریز" میں جس "بعد کی افترا پردازی" کا ذکر ہے اس میں ہرگز نیاز صاحب کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ نیاز صاحب نے تو صرف اُتنی خبر شایع کی جتنی کہ اُن کو دی گئی۔ میرا روئے سخن اُس گروہ کی طرف تھا جو

اس قسم کی خبروں کو تحشیہ اور مبالغہ کے ساتھ مشہور کرتا ہے اور جس کا کبھی بھی دنیا میں قحط نہیں رہا۔ لیکن اس بحث کو طوالت کیوں دیجئے۔ میں نے تو صرف اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ خدا کرے یہ خبر غلط ہو، اور اگر غلط نہیں ہے تو کسی طرح اس کا ابطال ہو سکے۔ تلخ حقیقت کے ابطال کی خواہش عین فطرت بشری ہے۔ اس خواہش سے نہ کوئی حقیقت باطل ہوئی ہے اور نہ کوئی ایسا سمجھتا ہے۔ یہ تو محض ایک قسم کی خود فریبی ہوتی ہے جو چاہے کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو مگر ہے فطری۔

اور یہ بیچ میں "احسان فراموشی" کا کیا ذکر ہے؟۔ اگر مراد شفقت مرحوم کی موت سے ہے تو مرحوم کی روح کو بھی مجھ سے اتفاق ہوگا کہ لفظ کا استعمال بے محل ہے اور اس کے سوا کوئی اور مراد ہے تو یہ سارا جملۂ معترضہ بے اصل و بے معنی ہے۔

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تذکرہ میرے لئے کس قدر باعث ہیجان و انتشار ہے۔ نہیں نہیں کر کے بھی میں نے اس کو اتنی دیر ملتوی رکھا۔ مگر آخر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنا ہی ہے۔

میں اس کو اپنی کم ہمتی اور بزدلی کہوں یا کیا کہ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ نگار میں "شہید سمن پوش" کی خبر شائع ہوئی ہے تو ایک بار بے اختیار میں نے بھی اُس پرچہ کو اٹھا کر دیکھا۔ لیکن میں خود کچھ اس قدر متالم ہو رہا تھا کہ نگار کے "ملاحظات" کے اتنے حصہ پر بس ایک اُچٹتی ہی نظر ڈالنے کی ہمت کر سکا۔ اس کے بعد پھر اتنی تاب اپنے اندر کبھی نہیں پائی کہ دوبارہ اُس کو دیکھتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک مجھے مرنے والے کا نام نہیں معلوم۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ علی گڈھ کے بی، اے تھے۔ وہ بھی اس لئے کہ میرے احباب اکثر گفتگو اور تحریر میں اس کی

یاد دلاتے رہے۔ میں ایسے واقعات کو بھول جانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ اس سے جس کا جو جی چاہے نتیجہ نکالے۔ مگر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی کوشش بجائے خود ایک المناک ہوتی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں؟ یہ میرا اپنا راز ہے۔ جس سے کسی کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے اور اگر اب بھی آپ کو ضد ہے اور آپ پوچھتے ہیں تو میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں:-

اگر سرے نہ کشم سوئے بےخودی چہ کنم
مرا ز ہمدمیٔ خود ملال می گیرد

ہاں تو مجھے آج معلوم ہوا کہ "شہید سمن پوش" کا نام یا تخلص شفقت تھا۔ نیاز صاحب نے اعلان کیا تھا کہ وہ آئندہ اس "جاں دادۂ تخئیل" کے مفصل حالات زندگی اور اس کی سیرت و شخصیت ناظرین نگار کے سامنے پیش کریں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اس کی پوری کوشش کی ہوگی۔ مگر شاید اُن کو مواد نہ مل سکا۔ یعنی جس نے اُن کو یہ مختصر خبر بھیجی تھی شاید پھر اس نے اس طرف اعتنا نہیں کیا۔ آخر اس کو کیا سمجھا جائے؟۔ کاش! اب بھی جو لوگ تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہوں اس طرف توجہ کریں اور مرنے والے کے سوانح حیات اور اُن کی سیرت لکھ کر نگار یا ایوان کو بھیجیں۔

یہ تجربہ غالباً ہر شخص کو ہوگا کہ جب کوئی عزیز مر جاتا ہے تو لوگ فوراً اس سنگین حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بار بار مرنے والے کا شانہ ہلایا جاتا ہے، اس کا نام لے کر پکارا جاتا ہے۔ غرضکہ ہر طرح اپنے کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مرنے والا ابھی مرا نہیں ہے، اور یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ ہم درجا کی خود فریبیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انگریزی کا مشہور الم نگار شاعر "ٹامس ہڈ"

ایک مرثیہ میں لکھتا ہے:۔

"ہماری اُمیدیں ہمارے دھڑکوں کی تردید کرتی تھیں اور ہمارے دھڑکے ہماری اُمیدوں کو جھٹلاتے تھے۔ جس وقت کہ وہ سوتی ہوئی تھی اُس وقت تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ مرگئی اور جب وہ مرگئی تو ہم نے یہ سمجھا کہ سو رہی ہے"

ایسی ہی حالت کے ماتحت میں نے اپنے "گریز" میں لکھا تھا کہ "مگر خدا کرے کہ یہ سب بعد کی افترا پردازی ہو۔ اور میرے فسانہ پر ایک بہتان" مگر اب تو اس کی گنجائش ہی نہیں۔ اب تو حقیقت کو حقیقت ماننا ہے۔

میں اِس بحث کو یہ کہہ کر بھی ختم کر سکتا تھا کہ یہ میرے اور شفقت مرحوم کے درمیان کا معاملہ ہے۔ کسی تیسرے کو باز پرس کا کیا حق ہے؟ اور یقین مانئے رات کے سناٹے میں مَیں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں اور میرے کانوں میں یہ آواز آرہی ہے:۔

"چھٹے ہم زندگی قید سے اور داد کو پہونچے"
"وصیت ہے ہمارا خونبہا جلاد کو پہونچے"

لیکن آج میں اپنے دل سے مجبور ہوں کہ مرحوم پر ایسے آنسو بھی گراؤں جس کو ساری دُنیا آنسو سمجھے۔ ورنہ اس سے پہلے جو کچھ "سمن پوش" میں لکھا وہ بھی آنسو ہی گرانا تھا۔ سطحی نگاہیں اس کو آسانی سے تسلیم نہیں کرسکتیں کہ وہ آنسو زیادہ مہلک اور جاں گداز ہوتے ہیں جو مسکراہٹ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ایک عالم وہ بھی ہوتا ہے جبکہ اپنے دل کی زبوں حالی پر ہنسی آتی ہے۔

میں شفقت مرحوم کی موت کو کیا سمجھتا ہوں؟ اس کا جواب دینا میرے لئے آسان کام نہیں ہے۔ شاید اس سے آپ اندازہ کرسکیں کہ میرے دل میں اکثر

یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش! شفقت مرحوم یا کوئی اور "سمن پوش" کا لکھنے والا ہوتا اور مجھے اتنی توفیق ہوتی کہ اس کو پڑھ کر اسی طرح جان دے سکتا۔ مگر ایسی حسرتیں پوری کب[۱] ہوتی ہیں۔ یہاں تو مُوتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا کی صعوبتیں جھیلنا ہیں جو شاید خلقت کی سب سے بڑی المناکی ہے۔

شفقت مرحوم نے مر کر کائنات کے اس دور اولیں کی یاد تازہ کر دی ہے جبکہ دنیا جوان تھی اور محض حوصلۂ عشق پر جیتی تھی، جبکہ شہادت کا ذوق سب کو تھا اور جاں نثاری کی فرصت عام تھی۔

میں نے گزشتہ "ایوان" کے "اداریہ" میں ایک دوست کی تحریر کے جواب میں غلط نہیں لکھا ہے کہ "دنیا جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے دل والوں کی تخلیق میں کمی ہوتی جاتی ہے اور جو دل والے موجود ہیں اُن کے دل بُری طرح افسردہ ہو رہے ہیں۔" آج اگر واقعی کوئی گوشت و پوست کی "سمن پوش" اس دنیا میں پیدا ہو جائے تو اس پر جان دینا تو ایک طرف مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا جو اس کے بہے ہوئے خون پر اپنا پسینہ بہانے کے لئے تیار ہو۔ شفقت مرحوم نے تو اس "سمن پوش" پر جان قربان کی جو دنیائے تخئیل کی مخلوق تھی۔ اسی لئے میں نے اُن کو "جان دادۂ تخئیل" کہا ہے۔ آہ!

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائمؔ
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

اور مرنے والے کی روح اس بات کی تائید کرے گی کہ یہ اس کے حق میں بہتر ہوا اس لئے کہ یہ "دل" "خالص محبت" رومانی اور شاعری کی دنیا کے لئے بنا تھا۔ اس وسیع دنیا کا اگر کبھی وجود تھا تو اب وہ معدوم ہے۔

[۱] اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں "سمن پوش" کو کوئی ادبی کارنامہ تصور کرتا ہوں۔ — نیاز

میں نے اس تعزیت کا عنوان "افسانہ کا افسانہ" رکھا ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں پھر اس سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس کی توضیح ضروری ہے۔ مجھے ہر حقیقت میں ایک افسانوی میلان یا تخئیلی امکان نظر آتا ہے اور میں افسانہ کو حقیقت سے اونچی چیز سمجھتا ہوں جو حقیقت کی ہیئت کو بدل کر تخئیل سے قریب کر دیتا ہے۔ حقیقت ہمیشہ تلخ اور ناگوار ہوتی ہے، افسانہ اس کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ افسانہ تخئیل کا دوسرا نام ہے۔ "شہید سمن پوش" میرے لئے ایک تخئیل ہو کر رہ گیا ہے جو ابد ازل و ابد پر محیط ہے۔ اسی لئے میں نے اس تذکرہ کو یہ عنوان دیا ہے۔

میں شفقت مرحوم کی روح سے شرمندہ نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میرا ایمان یہ ہے کہ وہ زندۂ جاوید ہیں، اور اگر لوگ مانیں تو میری خواہش یہ ہے کہ ان کی قبر پر ایک طرف حافظ کا یہ شعر کندہ کرا دیا جائے:۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اگر یہ شعر واقعی کسی کے لئے کہا گیا تھا تو وہ یہی "شہید عشق" ہے اور اگر اس شعر کو پامال اور فرسودہ سمجھ کر ٹال دیا جائے تو پھر اس کے بجائے نظیری کا یہ شعر ہو:

دوشش بر سوز دل و سینہ برا تم دادند
سر چو شمعم ببریدند و حیاتم دادند

مجھے امید ہے طور صاحب یا کوئی اور صاحب مجھے سمجھنے میں اب کے غلطی نہ کریں گے۔

مجنوں

(مطبوعہ ایوان ستمبر ۱۹۳۲ء)

گرُیز

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا
(۱) (میر)

اپنے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ پیش کرتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ پھر اپنے یا اپنی افسانہ نگاری کے متعلق کچھ کہوں، میں نے فسانہ نگاری کیسے شروع کی اور کیوں؟ اس حکایت کو کم و بیش اپنے پہلے مجموعۂ "خوابِ خیال" میں "ناچار مسلمان شو" کے ماتحت سُنا چکا ہوں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں یہ کہے جاؤں گا کہ فسانہ میری ادبی زندگی کا نصب العین نہیں تھا اور شاید اب بھی نہیں ہے۔ زندگی کی دلچسپ ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرے جاننے والے مجھے فسانہ نگار جانتے ہیں اور اکثر یہ بھی چاہتے ہیں کہ میں فسانہ کے سوا کچھ اور نہ لکھوں۔ میں اس کا سبب صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی اُردو خواں طبقہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو اُردو زبان میں بھاری اور ٹھوس مباحث کے متحمل ہو سکیں۔ ممکن ہے اس میں کسی حد تک یا کافی حد تک اس سبب کو بھی دخل ہو کہ پڑھنے والوں کو افسانوں میں بالعموم اپنی ہی بنی یا بگڑی ہوئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اگر افسانے واقعی بصیرت کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے وہ افسانے کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔ بہر حال سبب جو کچھ بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ فسانوں کی ہر طرف زیادہ مانگ ہے اور اسی رعایت سے میں زیادہ تر فسانے لکھتا ہوں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ افسانے کا مرتبہ ادبیات میں کم سمجھتا ہوں۔ تاہم میری فسانہ نگاری کے جہاں اور اسباب ہیں وہاں ایک خاص سبب آپ لوگوں کا عام رجحان بھی ہے۔

یہ فسانے کیسے ہوتے ہیں اس کا فیصلہ تو آپ کیجئے مگر جیسے ہیں ویسے کیوں ہوتے

ہیں۔ یہ سوال البتہ مجھ سے کیا جا سکتا ہے اور اکثر پوچھا بھی جاتا ہے مگر شاید اس کا شافی جواب مجھ سے نہیں مل سکتا۔ اگر کسی شاعر یا مصور سے پوچھا جائے کہ تمہارا فلاں شعر یا فلاں نقش ایسا کیوں ہے؟ تو وہ اس کا جواب سوا اس کے اور کیا دے سکتا ہے کہ میری طبیعت نے یوں ہی بتایا۔ یہاں یہ سوال غیر متعلق ہے کہ وہ شاعر یا مصور اپنے فن میں کیا مرتبہ رکھتا ہے، اس کا جواب بہر حال باصواب ہو لیکن شامت تو یہ ہے کہ پوچھنے والے کی اس سے تسکین نہیں ہو گی۔

(۲)

بہر حال مجھے بُرے بھلے اس سوال کا جواب دینا ہے کہ میرے افسانے ایسے کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن اس سے پہلے یہ بھی جان لیجئے کہ میں فسانہ کو کیا سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں فسانہ کی اصل و غایت وہی ہے جو تمام فنون لطیفہ کی ہے، یعنی حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ دنیا اُس حقیقت کو پا سکے اور اس کی متحمل ہو سکے۔ فسانہ نام ہے حقیقت کی تلاش کا اور شاعری اور تصوف کی طرح فسانہ کی اصلیت بھی وہی ہے جو بہتر فرقوں کی جنگ کی ہے۔ یعنی:-

"چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

فرق یہ ہے کہ یہ بہتر فرقے اس فسانہ کو عین حقیقت سمجھتے ہیں اور ہم لوگ اس کو حقیقت کا "نعم البدل" جانتے ہیں۔ غرضکہ فسانہ کو زندگی کے حقائق سے ازلی تعلق ہے اور وہ ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ یہ سچ ہے کہ فسانہ کا کام کھلم کھلا تلقین و تبلیغ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی فسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے اندر نئی بصیرت پیدا کرے اور حقائق کے پوشیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالے۔ فسانہ نگار معلم اخلاق نہیں ہوتا مگر اس کے افسانوں سے آپ جو درس عبرت و بصیرت لیتے ہیں اُن میں زیادہ صدق و خلوص ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی حقیقتوں کو انسانی سطح سے دیکھتا ہے

اور دکھاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے واقعات سے اجنبیت نہ برتے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان سے قریب ہی قریب رہے۔ اُردو زبان میں فسانہ کا ذکر ہی کیا۔ لیکن اگر دنیا کے فسانوں کا تاریخی مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو کہ روز بروز فسانہ کا میلان خواب وخیال کی دنیا سے ہٹتا گیا ہے اور دُنیا کے واقعات سے قریب تر ہوتا گیا ہے۔ اگر افسانہ کو بہ حیثیت ایک صنف ادب کے زندہ رہنا ہے تو اس کو ان حقیقتوں کی ترجمانی کرنی چاہیئے جو حیاتِ انسانی میں ہمہ گیر ہوں اور اہمیت رکھتی ہوں۔

میری فسانہ نگاری کا نصب العین بھی یہی رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کامیاب رہا یا نہیں مگر کم سے کم میری نیت کے خلوص کی داد تو دے ہی دیجئے۔ میں کبھی اپنے فسانے میں قصد واہتمام کے ساتھ کوئی نکتہ یا عقدہ نہیں پیش کرتا۔ لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے ضرور رکھتا ہوں اور مشاہدہ ومطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے۔ چنانچہ میرے بیشتر افسانے محبت کے افسانے ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے کسی ایک کو بھی "آپ بیتی" سمجھنا پڑھنے والے کی تنگ خیالی کی دلیل ہے۔ میں اپنے ہر پڑھنے والے سے پوچھتا ہوں کہ کون سا افسانہ ایسا ہے جس کے کچھ نہ کچھ ٹکڑے خود اُس کی "آپ بیتی" نہ ہوں، اس لئے اس ذیل میں مجھ کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

اسی سلسلہ میں میں اپنے چند نقادوں کی طرف بھی رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُن کی تردید کرنا تو فعلِ عبث سمجھتا ہوں اس لئے کہ یہاں میں لکُم دِینکُم وَلِیَ دِین کا قائل ہوں، مگر اُن کے خیالات کو خود اُن کے لئے واضح کر دینا ضرور سمجھتا ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میرے فسانے عموماً طبع زاد نہیں ہوتے اس کے جواب میں میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ خدا کی اس دُنیا کسی کا کوئی

اکتساب طبع زاد نہیں ہوتا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرا کوئی فسانہ طبع زاد نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میں افسانوں کی بنیاد یا تو مشاہدہ پر رکھتا ہوں یا مطالعہ پر۔ لیکن دو تین افسانوں کو چھوڑ کر میرا کوئی فسانہ نہ تو ترجمہ ہے اور نہ کہیں سے ماخوذ۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہے سمجھے۔

ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو بچوّں کی طرح یہ رٹ لگا رہا ہے کہ میرے افسانوں میں جدّت کم ہوتی ہے۔ اس کا جواب میں ایک دفعہ اور کہیں دے چکا ہوں۔ زندگی میں جدّت نہیں تو فسانہ میں جدّت کہاں سے آئے جب ہر شخص کی زندگی کا آغاز و انجام اور اس کی رفتار یکساں ہے تو جدّت طرازی محض فعل عبث ہے۔

(۳)

میں کہہ چکا ہوں کہ میں جذبۂ جنسی یا محبت کو کم سے کم انسان کی سب سے بڑی بدبختی سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے آئندہ چل کر کبھی میرا خیال بدل جائے۔ ابھی تک تو اس کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ بہر حال آپ چاہے پندار و افتخار کے ساتھ یہ کہیں:۔

"بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی است ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا ایں جاست"

یا جھلا کر یہ کہیں:۔

"سخت کافر تھا جس نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا"

حقیقت ایک ہے اور آپ دونوں صورتوں میں اسی کا اظہار کر رہے ہیں یعنی:۔

محبت نام اور ہر دل نگیں ہے
محبت سے کوئی خالی نہیں ہے

اور یہ محبت مجھے مرنے کے بعد بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اسی خیال سے متاثر ہو کر میں نے یہ چند افسانے لکھے ہیں جو اس سے پہلے رسالوں میں چھپ چکے ہیں میں

نے اپنے اس خیال پر "دُنیائے آب و گل سے دُور" میں مدلل اور مفصل بحث کی ہے جو اس مجموعہ میں بطور مقدمہ شامل ہے۔ اس خیال کو آسی کی زبان میں یوں سنئے:۔

غبار ہو کے بھی آسی پھروگے آوارا
جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

(۴)

اس مجموعہ میں جو فسانے ہیں وہ سب شائع ہو چکے ہیں یعنی "سمن پوش" اور "حسن شاہ" علی الترتیب نگار جولائی ۱۹۲۶ء و اگست ۱۹۲۷ء میں۔ "تم میرے ہو" مرقع اپریل ۱۹۲۷ء میں۔ "سبز پری" اور "محبت کا جوگ" جن ۱۹۳۰ء میں۔ "محبت کا جوگ" جن میں "محبت کا انتقام" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ ان تمام فسانوں پر نظر ثانی کی گئی ہے، اور اکثر مقامات پر ان میں کافی ترمیم بھی ہوئی ہے۔ "دنیائے آب و گل سے دور"، جن کا افتتاحیہ مقالہ تھا جو گمنام شائع ہوا تھا۔

"جن" کا نام آتے ہی مجھے بے اختیار ۱۹۲۹ء کا زمانہ یاد آجاتا ہے جبکہ میرا قیام مستقلاً لکھنؤ میں تھا، اور میں اور امتیاز دونوں نظیر آباد میں ساتھ رہتے تھے۔ دفتر نگار کا پڑوس تھا۔ صبح و شام نیاز صاحب کے وہاں نشست رہتی تھی اکثر تینوں ساتھ ساتھ سینما جایا کرتے تھے۔ "جن" کی شانِ نزول ایسی ہی ایک صحبت تھی۔ ایک شام کو ہم تینوں دفتر نگار سے اُٹھے اور سینما کے لئے چلے۔ راستہ میں خیال ہوا کہ حامد اللہ افسر صاحب کو بھی ساتھ لگائے چلا جائے۔ افسر صاحب کے وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنا پڑا مختلف مباحث پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی دوران اردو ادب کی کساد بازاری اور رسائل کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر چھڑ گیا۔ نیاز صاحب کہنے لگے کہ آج انگریزی میں جس موضوع پر چاہو رسالہ نکال دو اور وہ

اپنا بازار پیدا کرے گا۔ لیکن آخر اردو میں کونسا موضوع اختیار کیا جائے جس کی مانگ ہو۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ اگر روحانیات سے متعلق کوئی رسالہ جاری ہو تو یقیناً اس کی مانگ ہو۔

نیاز صاحب کو اس رائے سے اتفاق تھا مگر کہنے لگے کہ "اس کی ترتیب وتدوین کا ذمہ کون لے؟" میں نے کہا۔ "نیاز صاحب! یہ سوچیے کہ اس کے مصارف کون برداشت کرے؟ دو جزو بھر دینے کا بیڑا میں اٹھاتا ہوں"۔ بات ہی بات میں سب کچھ طے ہو گیا۔ نیاز صاحب رسالہ نکالنے کے لئے تیار ہو گئے اور میں اس کو مرتب کرنے کے لئے۔ سب کی رائے تھی کہ ایڈیٹر کا نام "جن" کی رعایت سے "جان" ہو۔ نیاز صاحب نے بھی اتفاق کیا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد میں لکھنؤ چھوڑ کر گورکھپور چلا آیا اور یہیں سے نومبر کے مہینہ میں چار ماہ کے پرچے مرتب کرکے نیاز صاحب کے پاس بھیجدیئے۔ اردو میں مضمون نگاروں کا جو حال ہے وہ معلوم ہے۔ بیشتر مضامین بالخصوص فسانے اور علمی مقالات مجھی کو لکھنے بھی پڑے۔ چونکہ ابھی سال بھر پہلے میں روحانیات کے مطالعہ میں مشغول رہ چکا تھا اس لئے مجھے کچھ زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک یا دو کے علاوہ میں نے کل مضامین بے نام لکھے۔ اس لئے کہ میں ہی درپردہ اس کا مدیر قرار دیا گیا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہے جن کو شاید میں کبھی اپنے نام منسوب نہیں کروں گا۔ لیکن جن مضامین کو میں نے ذوق وانہاک کے ساتھ لکھا تھا اُن سے اکثر کو میں نے اس مجموعہ میں شامل کر دیا ہے۔

جس وقت "جن" کا پہلا پرچہ مجھے گورکھپور میں ملا تو مدیر کی جگہ نیاز صاحب کا نام دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے اُن کو لکھا کہ آخر اس میں کیا مصلحت تھی؟ انھوں نے لکھا کہ توسیع اشاعت کے لئے ان کا نام ہونا ضروری تھا۔

میں بھی مطمئن ہو گیا معلوم نہیں "جن" کی اشاعت کا کیا حال رہا۔ شاید اچھا نہیں رہا۔ اس لئے کہ اگر میں بھولتا نہیں تو پرچہ کو دوسرا سال دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

سوچتا ہوں تو اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کو ایک عمر ہو گئی۔ شاید حال نام ہی ہے ہر بات کو بھولتے جانے کا۔

(۵)

آخر میں مجھے ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا ہے جو اگر واقعہ ہے تو نہایت المناک ہے۔ اس مجموعہ میں پہلا فسانہ "سمن پوش" ہے جو میری ابتدائے مشق کی یادگار ہے۔ یہ فسانہ فنی اعتبار سے کامیاب ہو یا ناکامیاب، مگر ہے نہایت معمولی، اور خود میری نظر میں اس کی کوئی ممتاز اہمیت نہیں ہے۔ لیکن لکھنے والے اور پڑھنے والے ہمیشہ متفق الرائے نہیں رہتے۔ کئی سال ہوئے نگار میں یہ خبر دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کے بی۔ اے تھے میرے اس فسانہ پر جان دیتے تھے، وہ اس کو وظیفہ کی طرح پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ فسانہ میری جان لیکر رہے گا۔ سنا جاتا ہے کہ پھر یہی ہوا۔ یعنی ایک بار فسانہ پڑھتے پڑھتے اُن کے قلب کی حرکت رُک گئی۔ سچ ہے موت کے لئے بہانے بے شمار ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۰ مگر خدا کرے یہ سب بعد کی افترا پردازی ہو اور میرے فسانہ پر محض ایک بہتان۔

مجنوں

گورکھپور ۱۴۔ اگست ۱۹۳۴ء

دنیائے آب و گل

سے

دُور

چو در روزِ قیامت ہر کسے خیزد بسودائے
شہیدِ نرگسِ او از لحد دیوانہ می خیزد

(نظیریؔ)

دنیائے آب و گل سے دور[۵۱]

ایں حکیماں چوں سبب آموختند
چشم از آیاتِ قدرت دوختند

ایک ضعیف الارادہ عاشق نے کسی از خود رفتہ فلسفی سے پوچھا کہ شادی کرنا چاہئے یا نہیں؟ فلسفی نے جواب دیا "جو جی میں آئے کرو پچھتانا بہرحال ہوگا"۔ لیکن بیچارے عاشق کو ان دو صورتوں میں سے آخر کوئی ایک صورت اختیار کرنا ہی تھی محتمل الضدین کے صرف دو پہلو ہوتے ہیں:۔ "ہاں" یا "نہیں"۔ ان کے درمیان کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کسی مابہ النزاع مبحث پر قلم اٹھانا بھی بالکل ایسا ہی ہے، لکھنے والے کو "ہاں" یا "نہیں" کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور پھر پچھتانا ہوتا ہے۔ علم کی ترقی کے ساتھ تشکیک کا زور بھی بڑھتا جاتا ہے اور جاننے والے کو کسی موضوع پر کوئی قطعی حکم لگاتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ حقیقت کہیں بالکل اس کے برعکس نہ ہو، اس لئے کہ دنیا میں جس طرح نہ کوئی چیز خیر محض ہے اور نہ کوئی چیز شر محض۔ اسی طرح کائنات کا اصل راز یہ ہے کہ نہ کوئی بات یکسر حقیقت ہے اور نہ خلاف حقیقت۔

روحانیات اور ماورائے عالم محسوسات کے متعلق میری بالکل یہی حالت ہے،

---

[۵۱] یہ مضمون اول اول رسالہ "جن" (بابت جنوری سنہ ۱۹۳۰ء) میں گمنام شائع ہوا تھا۔ اب اس کو نظر ثانی اور مزید تحشیہ اور اضافہ کے ساتھ اس مجموعہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔　مجنوں

میں خود اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو روحانیات کے مُبلغ ہیں۔ لیکن میرے اکثر احباب اس گروہ کے زبردست اور سربرآوردہ اراکین ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ میں خود بھی ایک حد تک اس گروہ کا ہم خیال ہوں یعنی اس کے دعاوی کو لغو اور لاطائل نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس دُنیا میں بے شمار ایسے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کی نہ کوئی منطق ہے اور نہ کوئی سائنس، نہ اُن کو صحیح ماننے سے انکار کیا جا سکتا ہے، اور نہ قیاس واستدلال کی بنا پر اُن کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ آج اس دُنیا میں کثرت کے ساتھ ایسے شواہد موجود ہیں جو ہم کو اس سنگین حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ روحِ انسانی گوشت و پوست سے جدا ہونے کے بعد بھی تاثر وانفعال کی بدستور قوت رکھتی ہے اور اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں علی الاعلان روحانیین کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جو ہے وہ ذاتی ہے یعنی یہ کہ مجھے خود مرنے کے بعد زندہ رہنے کا حوصلہ نہیں ہے، اور "حیات بعد الممات" میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں۔ اِس زندگی میں میں نے کیا کیا؟ یا مجھ کو کیا ملا جو کسی آئندہ زندگی پر دلچسپی کے ساتھ غور کروں۔

کسی واقعہ سے صرف اس بنا پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ "مافوق الفطرت" ہے یا سمجھ میں نہیں آتا۔ قدیم یونانیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسوف وخسوف کیونکر واقع ہوتے ہیں، وہ ان مظاہر فلکی کی غلط توجیہ ضرور کرتے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کرتے تھے۔ پاسٹیور نے جب پہلے پہل "جراثیم" کا نظریہ دریافت کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا تو دنیا والوں نے اُس کا کتنا مضحکہ اُڑایا لیکن آجکل کی "مہذب" دُنیا نے نہ صرف اس کو ایک مدلل اور حکیمانہ نظریہ تسلیم کر لیا ہے بلکہ حفظانِ صحت کی ساری بنیاد اسی ایک نظریہ پر رکھ چھوڑی ہے۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ اگر

"الف لیلہ" کے زمانہ میں کوئی ہوائی جہاز کا ذکر کرتا تو لوگ اس کی باتوں کو خرافات سمجھ کر اُسی طرح ہنسی میں اُڑا دیتے جس طرح آج ہم "پریوں کے تخت" کو اُڑاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بات کا سمجھ میں نہ آنا اس کے ابطال کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ دُنیا میں کوئی بات دراصل "مافوق الفطرت" نہیں ہوتی، چاہے وہ کتنی ہی بعید از قیاس کیوں نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ آپ ایسے واقعات کو "فوق العادت" کہہ سکتے ہیں۔ روحانیات کے مسائل بھی اسی تحت میں آتے ہیں۔

آجکل یورپ اور امریکا میں باضابطہ انجمنیں قائم ہیں جو عرصہ سے "روحانیات" کے متعلق تحقیقات کر رہی ہیں، اور ان انجمنوں میں سر انڈر ہیگرڈ، سر آرتھر کونن ڈائل، سر الیور لاج وغیرہ جیسی گراں پایہ ہستیاں شریک ہیں۔ ان لوگوں نے ناقابل تردید مشاہدات کی بنا پر یہ کلیہ قائم کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح نہ صرف زندہ رہتی ہے، بلکہ اس کی پوری فردیت باقی رہتی ہے اور اس کی موت کے بعد کی زندگی اس کی اس آب و گل کی زندگی سے بہت بڑی حد تک ملتی جلتی ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد ہمارا کیا حال ہوگا؟ یہ موقوف ہے اس پر کہ ہمارا اس دُنیا میں کیا حال رہا ہے۔ انگریزی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے آسکر وائلڈ کے نام سے خوب آشنا ہوں گے، وہ شاعر تھا، تمثیل نگار تھا، نقاد تھا، ادبی نکات انگریزی زبان میں نزہت و پاکیزگی کے بہترین نمونے ہیں، لیکن اس کی ذاتی زندگی سراسر "عدوان" تھی، وہ نہایت کثیف قسم کی نفسانیت کا غلام تھا۔ اس کی تمام عمر طرح طرح کی بے چینیوں میں بسر ہوئی حال میں ایک عورت نے[1] "آسکر وائلڈ کے روحانی مراسلات" کے عنوان سے

---

[1] مرتبہ "مسٹر ٹریورس اسمتھ (HESTER TRAVERS SMITH)

ایک کتاب شائع کی ہے جس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے اِس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسکر وائلڈ عالمِ برزخ میں بھی اسی طرح سکون و اطمینان سے محروم ہے جس طرح کہ اس دُنیا میں تھا۔ وہی رکیک جذبات، وہی نفسانی ہیجانات اس کی روح سے اب تک لپٹے ہوئے ہیں، گویا "مکافاتِ عمل" کی دراصل یہ صورت ہوتی ہے کہ اگر آپ زندگی میں ناآسودہ رہے ہیں تو مرنے کے بعد بھی رہیئے۔ اس جگہ بے ساختہ ایک پُرانے اردو شاعر کا قول یاد آگیا۔

اخگر کو چھپا راکھ میں مَیں دیکھ یہ سمجھا تاباں تو خاک بھی جلتا ہی رہے گا

جس کتاب کا میں نے حوالہ دیا ہے اس کے ایک ایک حرف سے لکھنے والی کے صدق و خلوص کی بو آتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو جھوٹا سمجھیں۔ اس کے علاوہ وائلڈ کے جتنے مراسلات اس میں درج ہیں وہ سب وائلڈ کے خاص انداز میں ہیں، حالانکہ راقمہ نے اس سے پہلے آسکر وائلڈ کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی نہیں پڑھی تھی۔

روح اور روحانیات کے خلاف ایک نہایت بچر دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ "روحیں ہم کو نظر تو آتی نہیں، ہم زندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کو پھر کیسے تسلیم کرلیں"۔ سو اس بارے میں مجھے صرف اتنا جتا دینا ہے کہ آپ نہ جانے کتنی ایسی چیزوں کے وجود اور اُن کے اثرات کو مانتے ہیں جو غیر مرئی ہیں۔ روحوں کو آپ بیشک نہیں دیکھتے، لیکن آپ گیسوں کو کب دیکھتے ہیں۔ یا برقی رو کو کن آنکھوں سے دیکھتے ہیں؟۔ حالانکہ برقی رو دن رات آپ کی مزدوری کیا کرتی ہے۔ کہنے والے کہیں گے کہ کم از کم اُن آلات کو دیکھتے ہیں جن میں برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ تو ہم کہتے ہیں اُن آلات کو بھی آپ دیکھتے ہیں جن کے ذریعہ سے روحیں اپنا کام کرتی ہیں۔ مثلاً تپائی، تختہ، اور دیگر "آلاتِ حاضرات"۔ ایسے مسائل میں

صرف اُس دلیل سے کام چلتا ہے جو مولانا رومؒ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں پیش کی ہے :-

دست پنہاں و قلم بیں خط گزار اسپ در جولان و ناپیدا سوار

"روحانیات" کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ہر نسل، ہر عہد میں "حیات بعد الممات" یقین کرتی چلی آئی ہے، اور اس حد تک کہ زندوں اور مُردوں میں سلام و پیام کا امکان بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس کی نفسیاتی توجیہ جو کچھ بھی ہو مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد جاہلیت و بربریت میں اس یقین کا محرک خواب تھا۔ اس وقت کے غیر متمدن اور جاہل لوگ جب مردے کو خواب میں دیکھتے تھے تو بلا چون وچرا یہ سمجھ لیتے تھے کہ مرنے والا کہیں نہ کہیں اب بھی موجود ہے اور ہم سے اس حالت میں آکر ہمکلام ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ تاریکی اور جہالت کے اس دور میں بیداری اور خواب دونوں حالتوں کو یکساں واقعی سمجھا جاتا تھا۔

روحانیات جدیدہ میں مسمر (MESMER) اور سویڈن برگ (SWEDENBORG) کے نام تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ مسمر وائنا کا ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے "معالجات نفسی" کو ایسی کامیابی ہوئی کہ دُور دُور سے لوگ اُس سے اِس فن کو سیکھنے کی غرض سے آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے "مسمریزم" کا لفظ لغت میں آگیا۔ مسمر کو یہ بھی تجربہ ہوا تھا کہ "تنویم" (HYPNOTISM) سے نہ صرف مریض کا علاج کیا جاسکتا ہے بلکہ اُس کو اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مرض کو آپ پہچان لے اور اس کا معقول مداوا کرسکے۔ سویڈنبرگ کو سائنس کی دُنیا میں ایک عمر گزارنے کے بعد روحانیت کا قائل ہونا پڑا، کیونکہ اس کو روحانی مشاہدات و الہامات کا ذاتی تجربہ ہونے لگا تھا۔ وہ بحالت جذب و وجدان بڑے سے بڑے اولیاء، فلاسفہ، ملوک اور رہنمایاں

دین کو مثلاً کالوں (COLVIN) لوتھر (LUTHER) سسرو (CICERO) موسیٰ یوحنا وغیرہ کو دیکھ لیا کرتا تھا اور اُن سے اکثر مراسلے بھی حاصل کیا کرتا تھا۔ اُس وقت تک "نفس تحت الشعور" یا "شعور خفی" (SELF SUBLIMINAL) کے نظریہ سے لوگ واقف نہ تھے۔ اِس لئے یہ سمجھتے تھے کہ روحیں براہ راست ہم سے مخاطب ہوتی ہیں۔

ان لوگوں کے بعد اور بھی داعیان روحانیت گزرے۔ جن کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔

یہ انہیں کے تحقیقات کا نتیجہ تھا کہ آخر کار پروفیسر سجوک (SIDGWICK) پروفیسر بیرٹ (BARRET) اور پروفیسر مائرس (MYRES) وغیرہ نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ ان مشاہدات روحانی کی تفتیش کے لئے ایک باقاعدہ انجمن قائم کی جائے۔ اس کا نام "روحانیاتی تحقیقات کی انجمن" (RESEARCH SOCIETY EOR PSY CHI CAL) پڑا اور اُس نے "دور خیالی" (TELEPATHY) یا "نقل افکار" (THOUGHT TRANSFERENCE) "تنویم" (TISMHYPND) "خودنگاری" AUTOMATIC "خود مقالی" AUTOMATIC WRITING) SPEAKING) "غیب دانی" (CLAIRVOYANCE) اور اسی قسم کے اور بھی سیکڑوں مظاہر روحانی کی فلسفیانہ تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے صدر یکے بعد دیگرے برگسان (BERGSON) ولیم جیمس سر آلیور لاج وغیرہ جیسے بڑے بڑے فلسفی رہ چکے ہیں اور اس انجمن کی کارروائیاں ۲۵ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ انجمن سائنس کے جدید ترین اصول پر کام کرتی ہے اور تعصبات و توہمات کو مطلق راہ نہیں دیتی اس کے مشہور ترین تجربات و مشاہدات وہ ہیں جو امریکا کی مشہور معمولہ مسز بیط

(MEDIUM) مسٹر پائپر (MR. PIPER) کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں
مسٹر پائپر پر ایک حالت نیم خواب طاری ہو جاتی ہے اور اس حالت میں وہ خود بخود
لکھنا یا بولنا شروع کر دیتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ اس کو اکثر ایسی باتوں کا علم ہو جاتا
ہے جن کی خبر اس کو کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کوئی نہ کوئی
فوق العادت قوت ضرور اس کو اپنا آلہ بنا لیتی ہے۔

فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج بڑے بڑے ماہرین نفسیات اس بات
کے ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عالم ارواح سے مُراسلے اور مکالمے ہو سکتے ہیں اور
ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پردہ میں نہ جانے کتنی شعبدہ
بازیاں اور فریب کاریاں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن محض اِس بنا پر ہم کو حقائق
سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

میں مختصراً یہاں بتا دینا چاہتا ہوں کہ کون کون سے مظاہر ورایا "روحانیات"
کے تحت میں آتے ہیں۔ آج کل یورپ کے بڑے بڑے دماغ جن کو ائمہ روحانی
کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جن کے نام
اوپر گنائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے عام اور عالمگیر "تنویم" یعنی ہپناٹزم
ہے۔ اس کا عامل معمول پر اپنے ارادہ یا شخصیت کے زور سے ایک خواب کی حالت
طاری کر دیتا ہے۔ معمول اس حالت میں عامل کا حلقہ بگوش غلام ہو جاتا ہے۔
اور اس کے اشاروں پر چلنے لگتا ہے۔ آج کل عصبی اور نفسی امراض کے لئے
"تنویم" کو کامیاب ترین طریق علاج سمجھا جاتا ہے۔ روحانیات کا دوسرا
اہم کرشمہ "دور خیالی" یا "نقل جذبات" (TOEPATHY) ہے۔ اس کی
معمولی مثالیں تو ہم کو روزمرہ کی زندگی میں ملتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی
شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دور افتادہ عزیزوں اور دوستوں

کے دل پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ ماؤں کو خصوصیت کے ساتھ اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے لیکن "دور خیالی" دراصل دوستوں اور زندہ لوگوں تک محدود نہیں ہے تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ دو شناسا آدمیوں میں بلا حواس ظاہری کی وساطت کے تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے۔ خواہ وہ گہرے دوست ہوں یا نہوں، یا خواہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوں یا دونوں کے درمیان امریکا اور انگلستان کا فرق ہو۔ یہی نہیں بلکہ زندہ اور مردے کے ساتھ بھی نقل جذبات کا سلسلہ قائم کر سکتا ہے۔

آج کل جس مسئلہ پر سب سے زیادہ ہلچل مچی ہوئی ہے وہ "خود نگاری" اور "خود مقالی" کا مسئلہ ہے۔ "خود نگاری" اور "خود مقالی" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص جس کو اصطلاحاً معمول یا وسیط (MLOIUM) کہتے ہیں بیٹھتا ہے کچھ دیر میں اس پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ خود بخود کچھ لکھنے یا بولنے لگتا ہے۔ عموماً یہ کسی مرنے والے کے ملفوظات ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہر کس و ناکس معمول بن کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ خاص خاص لوگوں میں اس قسم کی ترجمانی کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہی اس کام کو کرتے ہیں۔

"غیب دانی" (CLAIRVOYANCE) بھی روحانیات کا ایک زبردست موضوع ہے۔ اکثر لوگوں کو چھپی ہوئی چیزوں کا بغیر کسی محسوس ذریعہ کے علم ہو جاتا ہے۔ بعض آدمیوں میں "ضمیر شناسی" کا ملکہ ہوتا ہے یعنی وہ دوسروں کے دل کی باتیں جان جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں ایک فوق العادت قوت ادراک تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ان مشاہدات کی توجیہ نہیں ہوتی۔

آخر میں میں بھوت، پریت اور جن کے مسئلہ کو بھی روحانیت ہی کا ایک مسئلہ سمجھتا ہوں اور ان کی توجیہ اور تشریح بھی انہیں نظریات سے ہوتی ہے جن سے روحانیت

کے اور مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ میں اس جگہ خواہ مخواہ دور از کار تاویلوں سے کام لینا نہیں چاہتا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ بھوت پریت کے اصل معنی کیا ہیں، یا "جن" کا لفظ قرآن میں کیا مفہوم رکھتا ہے، ان الفاظ کے خواہ وہی معنی ہوں جو عوام نے سمجھ رکھا ہے یا کچھ اور، لیکن اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک دنیا ایسی ضرور ہے جسے ہم اپنے ظاہری حواس سے معلوم نہیں کر سکتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نفسی اور روحانی مظاہر کی توجیہ بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں ان نظریات سے بحث کرنا نہیں چاہتا جو عہد جاہلیت میں انسان نے روحانی مسائل کو حل کرنے کے لئے پیش کئے ہیں مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ سائنس اور علمیات کی بنا پر ان مباحث پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ آجکل دنیائے نفسیات کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کا نفس دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو "شعوری" اور دوسرا "غیر شعوری" یا "تحت شعوری" ہم کو اپنے کیفیات شعوری کا علم تو رہتا ہے لیکن اُن کیفیات کا ہم کو احساس تک نہیں ہے جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے دبی پڑی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری شعوری زندگی کا دارومدار انہیں کیفیات غیر شاعرہ پر ہے۔ نفس ایک سمندر کے مانند ہے اور کیفیات شاعرہ مشابہ ہیں مختلف جزیروں سے۔ ہم اُن جزیروں کے صرف اُن حصوں کو محسوس کرتے ہیں جو سطح کے اوپر ہیں۔ لیکن ہم کو اس کا علم مطلق نہیں کہ سطح آب سے نیچے اُن جزیروں کی بنیاد کتنی گہرائی میں ہے جو ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ ہیں بعض لوگ صرف اس لئے "نفس غیر شاعر" کے وجود کے منکر ہیں کہ وہ اس کو براہ راست محسوس نہیں کرتے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی معقول منطق نہیں ہے۔ ہم قوت (ENERGY) کو نہیں دیکھتے مگر اس کا وجود طبیعیات میں تسلیم کیا جا چکا ہے، صرف اس لئے کہ اس کے آثار اور مظاہر محسوس کرتے ہیں ہم "ایتھر"

(ET IER) کو مانتے ہیں۔ "برق پاروں" (ELECTRONS) کے قائل ہیں، کیونکہ بغیر اُن کو تسلیم کئے ہوئے عالم مادیات کے نہ جانے کتنے مظاہر و مرایا سمجھ میں آنے سے رہ جاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ "نفس غیر شاعر" کے وجود سے انکار کر دیا جائے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی بنا پر کامیابی کے ساتھ اُن تمام واقعات کی توجیہ ہو سکتی ہے جن کو اب تک دُنیا معجزات و خوارق عادات اور نہ جانے کیا کیا واہیات خرافات سمجھ کر ٹالتی رہی ہے۔

اس "نفس غیر شاعر" کو صرف اُن گزشتہ ارتسامات کا دفتر نہیں سمجھنا چاہیئے جن کا ہم کو کوئی احساس نہیں ہے بلکہ اس کو دراصل ایسی ایسی قوتوں کا ایک گنجینہ سمجھنا چاہیئے جو ہمارے "نفس شاعر" کے حصہ میں نہیں آئی ہیں۔ ہمارا "نفس غیر شاعر" ایسے ایسے کرشمے ہم کو دکھا سکتا ہے جو ہمارا شعور خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہی "نفس غیر شاعر" ہے جو مجرم کی مجرمانہ ذہنیت، دیوانہ کی دیوانگی، شاعر کی شعریت، ولی کی ولایت اور نبی کی نبوت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

بھوت، پریت، ارواح، ملائکہ، جنات اور اس قسم کے دیگر مظاہر جو ہمارے حیطۂ شعور سے باہر ہیں اسی "نفس غیر شاعر" کے توسط سے ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں اور چونکہ اس قسم کے تجربات انسان کی زندگی میں شاذ و نادر ہوتے ہیں اس لئے ان کو یا تو توہمات سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے، یا "فوق الفطرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کارگاہ اسباب و علل میں کوئی چیز نظام فطرت سے علیحدہ نہیں ہے۔ ہر چیز کا ایک محسوس یا غیر محسوس سبب ہوتا ہے۔

جن روحانی تجربات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُن کے لئے ہر شخص یکساں موزوں نہیں ہوتا۔ بالخصوص جن لوگوں میں عقل و استدلال کا مادّہ ضرورت سے زیادہ

ہوتا ہے وہ اِن مشاہدات سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ضعیف الاعصاب لوگوں میں اور خاصکر عورتوں میں ان مظاہر و حوادث کو محسوس کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایسے لوگوں میں ایمان لانے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے، بلکہ درحقیقت اُن کا "نفس غیر شاعر" نفس شاعر" کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے، اور یہ لوگ "فوق الشعور" واقعات کا تجربہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

اِس کی ضرورت نہیں کہ "روحانیات" میں جتنے مشاہدات و تجربات ہو چکے ہیں اُن میں سے بعض کو مثالاً درج کیا جائے، کیونکہ جب منکر انکار پر تُل جاتا ہے تو پھر کوئی ثبوت، کوئی دلیل واقعی ہو یا خیالی اس کے لئے بیکار ثابت ہوتی ہے۔ میں مثالیں پیش کرتا جاؤں گا اور میرے مخالف اُن کو "طیف"، "التباس"، شعبدہ بازی، ہاتھ کی صفائی، نظر بندی، کہہ کہہ کر رد کرتے جائیں گے مجھے تسلیم ہے کہ آج کل روحانیات میں اس قسم کی فریب کاریاں کثرت سے ہو رہی ہیں۔ لیکن گیہوں دکھا کر جَو بیچنے والوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو واقعی گیہوں بیچنے والے ہیں۔

اِس سے پہلے اشارتاً یہ بتایا جا چکا ہے کہ نہ جانے کتنے حقائق ایسے ہیں جو ادنیٰ لوگوں کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، اور جن کو اگر محسوس کیا جا سکتا ہے تو حواس خمسہ یا عقل و استدلال کے ذریعہ سے نہیں بلکہ صرف ذوق و وجدان کی وساطت سے۔ لیکن آج کل جبکہ "مادیت کا عفریت" دنیا میں رفتہ رفتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ارباب بصیرت اِس نتیجہ پر پہونچ رہے ہیں کہ حواس خمسہ اور عقل و استدلال میں حقیقت کو کما حقہٗ محسوس کرنے یا سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں، ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمارے روزمرہ کے محسوسات

و معقولات کوئی حقیقت بھی رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مشکک ان کو عقل و حواس کی خود فریبی پر مبنی سمجھے جیسا کہ ہیوم اور دیگر ارتیابیوں نے کیا ہے تو ہم اس کی تردید کیونکر کر سکتے ہیں؟ اسی لئے اب فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ حقیقت جانی نہیں جاسکتی بلکہ صرف محسوس کی جاسکتی ہے اور اس کو محسوس کرنے کے لئے ایسی قوتوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو ہمارے اندر دبی پڑی ہیں اور جو کبھی کبھی شاعر کے شعر میں، مجذوب کی بڑبڑ میں، صوفی کے کشف و کرامات میں اور نبی کے الہامات میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

فرانس کے مشہور فلسفی "برگسان" نے نہایت واضح طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے عقل و حواس اس لئے بنائے ہی نہیں گئے کہ وہ ہستی کے اسرار کو سمجھا سکیں۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے وجدان زیادہ موزوں ہے، یہ وجدان بالعموم ہمارے "نفس غیر شاعر" کے اندر مجہول و معطل پڑا رہتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو محسوس کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اس وجدان کو ابھاریں اور اس کو اپنے نت نئے کرشمے دکھانے کا پورا موقع دیں، پھر بقول شیفتہ:۔

"دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں"

شعور کی شمع کو ہمیشہ کے لئے نہیں تو کبھی کبھی تو ضرور بجھا دینا چاہئے۔ پھر عالم نور سے نہ صرف اِستَفتِحوا کی آیت سنائی دے گی بلکہ وہاں کے تمام جلوے آنکھوں کے سامنے ہو جائیں گے۔ مگر ہاں! پہلی شرط یہ ہے کہ:۔

رو تو زنگار از رخ خود پاک کن بعد ازاں آں نور را ادراک کن

جب تک انسان کی آنکھوں پر عقل و ہوش کے پردے پڑے ہوئے ہیں اس وقت تک اس کو حقیقت کی صرف بیرونی سطح نظر آسکتی ہے جس کو اہل معنی "صورت" یا "مجاز" کہتے ہیں۔

۱۹۲۹ء

سمن پوش

"شہیدِ زخمِ شمشیرِ تغافل ا جرہا دارد"

(مرزا جلال اسیر)

سمن پوش

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جبکہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرہ میں دیکھی تھی، ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اُتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی، اور مُبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے مگر ناصری کو خود اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اُس پیکر جمیل میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اُس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس عورت کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی "ٹھہرو! اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔" اُس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اُس کے نیم برہنہ سینہ سے کھیل رہے تھے، اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالمِ محویت سے چونکا۔ ایک لرزش تھی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا

تھا کہ ناصری جو اپنا سامانِ نقاشی لینے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا واپس آگیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رُک گیا، ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا اور میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا مجھے یقین تھا کہ تصویر میں ایک ناقابل بیان چیز ہے جس کو کاغذ پر بجنسہ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اسی کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔

باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہاں وہی متوحش مگر شیریں مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اُتر آیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ سے ہو کر جا رہا تھا، یکایک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی، میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رُک گیا، مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا؟ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اُس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا، باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا جسم کی ساخت نازک تھی، رنگ میں صباحت تھی۔ دوش تک وہ عریاں تھی، اُس کی بلوریں گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا

کر رہی تھی، ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے، اور وہ ان کو برابر کرتی جاتی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا، راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اُس زہرۂ ارضی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں ؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، اس لئے کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا ؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا ؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے جس نے مجھ کو مشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر نے مجھ پر وہ ہیبت طاری کی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا، جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت پہنچ گیا۔ جہاں میں اپنے چند احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا، لہٰذا میں نے اُس تصویر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا صرف شاد کیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے، سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سمن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا، اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ "الفریڈ تھیٹر" آیا ہے، بالاتفاق یہ

طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیئے، چنانچہ اُس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیئٹر دیکھ رہا تھا، مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا، نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش۔ میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا، یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کئے ہوئے آرکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "اُس عورت کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے؟" "وہی جس کے گلے میں ہار ہے"

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا "نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے" میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا "آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے"

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے" اُس نے مجھ سے کہا۔

کوئی عورت نہیں! اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "شاید مجھ کو مغالطہ ہوا" اور فوراً بحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیئٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اُس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامانِ آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آرہا تھا، یعنی ایک خوبصورت پنکھا جس کو وہ کبھی کبھی جنبش دیدیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پُرحسرت انداز سے مسکراتی جس میں

پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا نہ ہونے دیتا تھا جب تماشہ ختم ہوا اور سب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھی اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی ایک جھلک دیکھی، اُس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے "کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سرِ نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے، یا محض میرا واہمہ مجھے پریشان کر رہا ہے؟" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔" لیکن اُس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اُس کے لئے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔

اسی کشاکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا، میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں، بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا، اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اُس تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر یہ

کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی، اے کیا تھا اور اس دورِ تعطل سے گزر رہا تھا جس سے اسکول اور کالج کا زمانہ ختم کرکے کم و بیش ہر شخص کو گزرنا ہوتا ہے یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتا پور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم، ایس، سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال میں ایک نیا گانوں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب اُن کی مسرتوں میں شرکت کریں، سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اُس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف حاصل ہو سکتا تھا جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حسنِ ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا، اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا، میں نے فوراً سامان سفر درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لاکر اتارا ہے تو میں اُس کی شوکت سے مرعوب ہوگیا، جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوس ارضی" کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہوگا، اس میں ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کہاں تک رچا ہوگا، اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی صاحب اور اُن کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا، شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہے تھے اور پھر بھی اُن کو سیری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گانون اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اُس کا نام جاننے کے لئے بیتاب ہوگے، اس کا نام "جمال الدین" تھا"

"جمال الدین!" میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کا ایک ڈراما "ہذیانِ محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی تھا، اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

صائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، وہ خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں، اُس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا، "آپ نے بُرا کیا جو سُہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سوچنے کا سامان فراہم کردیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آرہے ہیں۔ آپ نے اُن کو راحت شب سے بھی محروم کردیا۔"

میں نے مسکرا کر کہا "نہیں! نہیں!! قصہ سننے کے لائق ہے، ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے کیوں بیزار ہوگیا؟"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سنا ہے اُس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ اعلم کیوں قتل کردیا، جمال الدین اس صدمہ کو زیادہ نہ برداشت کرسکا اور غالباً سال ڈیڑھ سال کے بعد اُس نے بھی اپنا عنصری جامہ اُتار پھینکا۔ شاعر یوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں، اور اُن کا کسی زُد میں خودکشی کرلینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزا پایا جاتا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بھی بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا "شمیم! تمہاری گفتگو نے مجھے مکدر تو بہت کیا، لیکن تم سے اس کے سوا اُمید ہی کیا ہوسکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کررہا ہے لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں، تم جو دل کو ایک پارہ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے۔ تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو۔ بتاؤ تم نے اتنی سی عمر ضائع کرکے کون سی نئی بات حاصل کی؟۔

آئینکہ دل نام کردۂ بہ مجاز | روبہ پیشِ سگانِ کوانداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور جانوروں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو (PERIC ARDIUM) غلاف قلب میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے، مگر تم کو کیا کہوں بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انھیں خود فریبیوں میں مبتلا ہے، وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے۔ وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے، کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش" (LOGIC CHOPPERS) رکھا ہے کمبخت سب یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان کا علم صرف وضعی اور اعتباری ہو سکتا ہے۔ اس لئے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقار کا سدّ باب ہو گیا، وہ اپنا نصب العین بھول گیا۔ بلکہ اپنی اصلیت بھی اُس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو نہایت صائب رائے اس بارے میں دی ہے:۔

"ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور جو ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو "انسان" کہلاتی ہے"

میرے ہیجان کا دورہ شروع ہو گیا، میں انسان کا "جہل مرکّب" نہیں برداشت کر سکتا، یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگے تھے۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے، اس لئے کہ جہاں سوئی سے کام لینا چاہئے وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں، سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر میرا مقابل مجھ سے ہمیشہ متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا۔ جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا، اگر اُن کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں کہ "اچھا اب بے کار بحث کو جانے دو، ایک لطیفہ اور سُنو! گانوں والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے، اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا ہے، مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا تھا"

میں نے اپنے دل میں کہا "نہ جانے گانوں والے جاہل ہیں یا آپ" شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، اُنھوں نے کہا "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا۔ "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہوگا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا"

رات زیادہ جا چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خوابگاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا "آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، خدا کے لئے آج کی بحث پر زیادہ تبصرہ

نہ کیجئے گا۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔" سائرہ بچوں کی سی باتیں نہ کرو" اور اپنے بستر پر آکر لیٹ رہا۔ نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی، میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رُت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھیں لگ گئیں۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے، میں اُٹھ بیٹھا۔ شمیم نے کہا "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو نہیں گرم کئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ شمیم ہنس دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "تم شاید رات بھر سوئے نہیں، اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی۔"

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی۔" یہ کہکر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

میں نے باغ کو اُمیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے، ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے اُن کی پرداخت کرنے والا کوئی نہیں، تالاب کے چہار طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آگئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں پھر اپنے عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔"

میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔
چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے، لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی۔ اس پر گھاس اُگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر "ناہید" لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرا ایما پا کر ایک خدمتگار کو بُلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے، مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا، اس لئے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر رہا تھا، اور زمانے کی رگڑنے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا۔ میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں، لیکن کچھ بس نہ چلا، شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا، تا کہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔
یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چلئے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا۔ جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا، سارا دن ہارمونیم، فونوگراف تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر" میں "نماز" کے لئے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح کے کتبہ پر نظر ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا، نیند کے آثار اس دن

بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا، میرا مطالعہ بدستور جاری تھا کبھی کبھی کتاب بند کرکے کچھ سوچنے لگتا تھا۔

تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرے سے سگریٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھ سے چار پانچ گز کے فاصلہ پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "سمن پوش" اس وقت میں نے نہ حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس کو قائم رکھنے میں کامیاب رہا، میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا، گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔" اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟" اس نے پھر اسی طرح اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"یکسر" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا، جیسے تشنج کا دورہ بڑھ رہا ہو، میں گھبرا سا گیا۔ تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔" میرے لئے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لئے دعا نہیں کی، بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ اب "سمن پوش"

قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اُس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے، اُس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر اُن کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں" اُس نے کہا "آپ میرا پورا افسانۂ حیات سُننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے"

"ناہید؟ جمال الدین کی موضوعۂ پرستش؟" میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"ہاں......"

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دُہرانا اس کے لئے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

"ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں" اُس نے کہا میرا قاتل میرا شوہر تھا، لیکن اُس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی، اُس کو دھوکا ہوا جس کا مرتے دم تک اُس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ میری محبت کرتا تھا، ایسی محبت جس کی مثال اس دَورِ مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھئے وہ مجھ کو پوجتا تھا......

آپ خاموش سُنتے جائیے میرے لئے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا۔

اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ رہا۔ وہ کہا کرتا تھا، میرے دونوں جہان تیری آنکھوں میں ہیں "جمال منزل" اس نے میرے لئے بنوائی تھی، اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین و آسمان، چاند، سورج، دن، رات سب اسی کی تجلیاں ہیں، مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اسی کے طفیل میں ملی تھی۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برا نہیں ہو سکتیں"۔

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی، میں بیخودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی۔ یعنی آتش پرست"۔ اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان کرنا شروع کیا۔ "اور ایکٹنگ میرا ذریعۂ معاش۔ لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا۔ مگر مجھے کسی سے کبھی کوئی اُنس نہ ہوا تھا جمال نے مجھ کو ایک نئی لذت سے آشنا کیا، اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی، اس کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا اس کی آواز میں پپیہے کی سی دلدوز تاثیر تھی، سوز و گداز اس کے خمیر میں تھا، وہ سراپا تصویر درد تھا، میرا میلان ٹریجڈی کی طرف تھا اس لئے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا"۔

وہ ایک مرتبہ پھر زبان تر کرنے کو رکی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے، لہذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا، اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غمخواری کریں گے" اس نے مسترحمانہ لہجہ میں کہا "ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی"

"ہاں تو ہماری محبت خوش آیند ثابت ہوئی، جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحہ مسرت تھی، جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کر دی وہ متمول آدمی تھا، ادبیات اور مصوری کے ساتھ اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا، اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی۔ جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا، میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ یکایک زمانہ نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے ہوتی تھی، بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی مگر تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آجایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آکر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی، اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھیں۔ مگر جمال اس کی ہوسناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا، شاعر یا صناع

انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے، لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے، فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں، اُس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے، مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی کہ فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا، اور وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا، رات کو آٹھ بجے جبکہ اُس کی واپسی کا وقت تھا۔ میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی، دفعتاً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا، میں نے اُس سے پوچھا "یہ روشنی کیوں کم کر دی؟" میں سوال ختم نہ کرنے پائی تھی کہ میرا بازو اُس کی آہنی گرفت میں تھا۔ اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، مگر کمبخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا، دوسرے منٹ میں میں اُس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ اُن میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی۔ اُس کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ فیروز پھر میری سمت بڑھا۔ لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا فیروز کمرہ سے باہر نکل گیا اور میں

جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی، اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اُس نے یہ دیکھا اس وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑایا نہ تھا۔ جمال اُف! اُف!! کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اُس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا، اُس کی آنکھیں خوں کے مانند سُرخ ہو رہی تھیں، صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی، میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا "دغاباز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ "دغاباز" خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی برئیت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہا، اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات واقع ہوا تھا، اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا، اُس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ اُن دنوں بڑی محنت کر رہا تھا، اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا۔ لیکن اُس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔" ناہید کے آنسو گرنے لگے، میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اُس کے آنسو پونچھوں۔ لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا، اور پھر

سلسلہ یوں شروع کیا:۔

آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اُس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی، یہ محبت کی انتہا تھی کہ اُس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے شکسپیر کے مشہور ڈراما "آتھیلو" کا ترجمہ کر کے سُنایا تھا۔ میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ "کاش! مجھے اُس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا۔" اس پر اُس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ!۔

ناہید تھک گئی تھی، لیکن اب اُس کے چہرہ سے آسودگی ٹپک رہی تھی صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی۔ چلتے چلتے اُس نے کہا "ہاں! ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے، مجھے مار کر اُس کو تسکین نہ ہوئی تو اُس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا ؎

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی　　ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

اُس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے ؎

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام　　گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی، آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اُس شقی قلب کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا، اور جو "اسٹوڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے" یہ کہکر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمن زار تک اُس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منھ دھوکر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اور اس کو لے کر سیدھا اُس کمرہ میں گیا جو جمال کا "اسٹوڈیو" رہ چکا تھا، سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اُس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اِس گھر میں جتنے افراد ہیں اُن میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم کبھی مجھ کو دیوانہ یا فاترالعقل نہیں سمجھوگی۔" میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرا دیا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی، لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے اُمید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اُس کا بھی خوب مضحکہ اُڑایا گیا، مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔ مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ادعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتا۔ محبت بھی کیا معمّہ ہے، کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا منطقی اپنے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا ہے اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ "ضدّین" کا اجتماع اور "نقیضین"

کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو کانٹ اور اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے۔ لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود اُن کو اپنی اس رائے پر بھروسہ نہ ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعہ سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مایگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اُس مشہور مصوّر کی صناعی نہیں ہے، جس کا نام مجھے بتایا گیا، بلکہ جمالی کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

سنہ ۱۹۲۶ء

سبزپری

بمحشر ہر کسے کارے و ہر یارے و بازارے
من و آہوئے صحرائے کہ دائم می رمید از من

(نظیری)

سبز پری

(۱)

شاہد شاعر تھا، ادیب تھا، نقاد تھا، فلسفی تھا، غرضکہ بہت کچھ تھا۔ لیکن آج تک وہ اپنے کو منظرِ عام پر نہیں لایا، دنیا کو نہیں معلوم ہو سکا کہ کسی گوشہ میں کوئی شاہد بھی ہے جو میر و درد کے انداز کے شعر کہتا ہے، جو انگریزی، اُردو، فارسی اور ہندی کے شعراء پر بالکل انوکھی تنقیدیں کیا کرتا ہے، جو کانٹ اور ہیگل کے فلسفہ کی گتھیاں بات کی بات میں سلجھا کر رکھ دیتا ہے۔ شاہد کو جاننے والے شاہد سے مرعوب تھے۔ میرا اُس کا ایم۔ اے تک ساتھ رہا، وہ مجھے بہت عزیز رکھتا تھا۔ ایم۔ اے کے بعد میں برسرِ کار ہو گیا اور ایک مدت تک مجھے شاہد کی کوئی ٹھیک خبر نہیں ملی۔ اتنا جانتا تھا کہ اس نے کہیں نوکری نہیں کی۔ کبھی سنتا کہ آج کل گھر پر بیٹھا مطالعہ میں مصروف ہے، کبھی معلوم ہوتا کہ مبلغینِ اسلام کی جماعت میں شریک ہو گیا ہے، کبھی سُنتا کہ بنارس میں ترکِ اسلام کئے ہوئے اور قشقہ لگائے بیٹھا ہے، کبھی کیمیا کا سودا ہوتا اور تانبے کو سونا بنانے لگتا۔ بہرحال اُس نے نہ جانے کتنی کروٹیں بدلیں مگر کسی کروٹ اُس کو قرار نہ ملا۔ کچھ دنوں سے یہ سنکر مجھے تشویش تھی کہ شاہد کے دماغ میں کچھ فتور کی علامتیں رونما ہو چلی ہیں میں اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح چل کر اس کو دیکھ آؤں لیکن عرصہ تک اس کی نوبت نہیں آئی۔

(۲)

میں ایک ضرورت سے رخصت لئے ہوئے اپنے گانوں پر موجود تھا۔ ایک دن

شام کو میں سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ دور سے ایک یکہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آ کر یکہ رُکا اور شاہد اُس پر سے کود پڑا۔ میرا دل مارے خوشی کے اُچھلنے لگا۔ میں نے دوڑ کر اُس کو لپٹا لیا، لیکن شاہد کے تپاک میں فرطِ محبت کے ساتھ دیوانگی کا ایک شائبہ بھی تھا۔ اُس نے مجھے اس زور سے لپٹایا کہ میری پسلیاں دُکھنے لگیں۔ میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا تو وہ پاگل تو نہیں مگر کسی قدر مخبوط ضرور معلوم ہوتا تھا۔ شاہد نے میری طرف دیکھ کر کہا "کیوں جی احمد! کیا تم بھی مجھ کو پاگل سمجھتے ہو؟" شاہد کی مسترحم آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ میں نے جلدی سے جواب دیا "تم تو واقعی پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو، آخر تم کو پاگل سمجھنے کی وجہ؟" شاہد نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "آج پورے ڈیڑھ سال کے بعد یہاں آنا ہوا، نہ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ احمد کے گانوں پر چلوں اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آج کل احمد رخصت پر ہیں تو میں بے تامل چل کھڑا ہوا۔ ہاں جی احمد! تم کو نہیں معلوم کہ اب سے کئی پشت پہلے میرے مورثوں نے اس جوار میں حکومت کی ہے۔ یہاں سے تھوڑے دور پر کوئی گانوں سردار ہے وہی ہمارا مسکن رہ چکا ہے۔ یہ خبر میرے لئے بالکل نئی تھی۔

رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد میں نے شاہد سے کہا "شاہد! تمہاری ساری بے چینیوں کا سبب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تم نے اب تک کسی سے محبت نہیں کی۔ اگر تم کسی سے محبت نہیں کر سکتے تو کم از کم اب کسی سے شادی کر لو اور اطمینان سے زندگی کے دن کاٹ دو۔

شاہد نے طنز کے ساتھ ہنس کر کہا "تم کیا جانو کہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟"

میں نے حیرت سے اُس کو دیکھ کر پوچھا "مجھے تو اب تک نہیں معلوم کہ تم کسی کی محبت بھی کرتے ہو۔ آخر وہ ہے کون؟"

شاہد نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "کیا بتاؤں"۔

مرا فروخت محبت و لے ندانستم   کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است

میں نے عاجز ہو کر کہا "ساری عمر اسی شاعری میں بسر کر دو گے؟"

شاہد کو جلال آگیا، اُس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "میں اسی لئے کسی کو اپنے دل کی حالت سے آگاہ نہیں کرتا۔ لیکن خیر! آج میں تم کو بتا ہی دیتا ہوں کہ میں کس کو چاہتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ کو فاتر العقل سمجھو گے۔ مگر تمہارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں جب اب سے دو سال پہلے تمہارے ساتھ تفریح کے لئے علی گڈھ سے یہاں آیا تھا تو میں نے اُس کو یہاں خواب میں دیکھا اور اُس کی صورت کا دیوانہ ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ میں اس کو "سبز پری" کہتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ سبز لباس میں تھی۔ جب میں بہت بیتاب ہوتا ہوں تو وہ مجھے خواب میں اپنی شکل دکھا جاتی ہے، مجھے اس کے وجود کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اور تمہارے وجود کا۔ میں اُس کی جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان چکا ہوں اور ...."

شاہد خاموش ہو گیا، وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شاید مجھ کو اس کے سننے کا اہل نہیں سمجھا۔ مجھے اب یقین ہو چلا کہ اس کے حواس میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ہے۔

(۳)

شاہد صبح کو تو میرے ساتھ سیر کو نکلتا تھا، لیکن شام کے وقت وہ تنہا نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ رات کو آٹھ بجے سے پہلے وہ کبھی مکان پر نہیں آیا۔ قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص خبط میں مبتلا ہے۔ مگر وہ نہ مجھ سے کچھ کہتا تھا اور نہ شام کی صحرا نوردیوں میں کبھی مجھ کو ساتھ رکھتا تھا۔ ایک ہفتہ اس کو آئے ہوئے ہوا ہوگا، ایک روز اُس نے کہا۔ "احمد! آج شام کو تم بھی میرے ساتھ

چلو، میں تنہا سبز پری کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا ہوں، اب تم بھی اس تلاش میں میرا ساتھ دو، میں نے رات بھر اس کو خواب میں دیکھا ہے۔" میں نے شاہد کے ساتھ رہنا ضروری سمجھا۔ اس کی حالت مجھ کو نازک معلوم ہوئی۔

شاہد کے منہ سے سردار کا نام سن کر مجھے سردار سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس لئے میری تحریک سے یہ طے پایا کہ سردار کی طرف چلا جائے جو میرے گاؤں سے اُتر دو میل پر تھا۔

گرمی کا موسم تھا، تقریباً چھ بجے شام کو ہم لوگ "کودوا نالہ" پر پہونچے "کودوا نالہ" ضلع بستی کی مشہور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "مہاتما بدھ" نے اسی کو پار کر کے اپنے شاہی لباس، گھوڑے اور خدمتگار کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا تھا۔ اور یہاں سے باقاعدہ تپسیا کی زندگی شروع کر دی تھی۔

"کودوا" کے اُس پار سردار کی سرزمین تھی، نالہ میں پانی زیادہ تھا۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی طرف نالہ پایاب ہو تو ہم لوگ وہاں اُس کو عبور کریں کہ اتنے میں شاہد یہ کہتا ہوا نالہ میں کود پڑا۔ "آخر میں پا گیا، وہ دیکھو میری "سبز پری" کھڑی مجھ کو بلا رہی ہے۔" میری نظر اُٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑی پرانی دیہاتی وضع کی عمارت سامنے ہے اور اُس کے دروازہ پر ایک سبز پوش عورت کھڑی ہاتھ کے اشارے سے کسی کو بلا رہی ہے۔ شاہد نالہ کو تیر چکا تھا اور اب اُس عورت کی طرف اس طرح بیتابانہ دوڑا جا رہا تھا جس طرح "کوہ ندا" کے گردنشین "یا اخی" کی آواز پر بے اختیار دوڑتے تھے۔ میں نے مشکل سے چند لمحے تک اس منظر پر غور کیا ہوگا کہ دفعتاً ایک ناقابل بیان خطرہ کے احساس سے مغلوب ہو کر میں بھی نالہ میں کود پڑا اور شاہد کے پیچھے دوڑا۔ لیکن شاہد مجھ سے بہت پہلے اس عورت تک پہنچ چکا تھا۔ اور وہ عورت اُس کو لے کر مکان کے اندر غائب ہو گئی تھی۔ میں نے

دروازہ کو کھلا ہوا پایا اور بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے مکان کے اندر گھس گیا۔ مکان بہت وسیع تھا۔ میں نے اُس کا ایک ایک کونہ چھان مارا نہ شاہد کو پایا اور نہ کسی اور متنفس کو۔ البتہ جس طرف جاتا تھا اُدھر سے ایک اُلّو نکل کر دوسری طرف کو اُڑ جاتا تھا، یا کوئی لومڑی اِدھر سے اُدھر بھاگ جاتی تھی۔ اندھیرا شروع ہو چلا تھا۔ میرے دل میں ایک قسم کی ہیبت پیدا ہوئی۔ آخر کار میں اُس پُراسرار عمارت سے باہر نکلا اور اپنے مکان کا راستہ لیا۔ راستہ میں ایک بڈھے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عمارت کوئی ڈیڑھ سو برس سے یوں ہی کھڑی ہوئی ہے۔ اور اس میں بھوت، پریت، جنات اور پریوں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔

اِس واقعہ پر میں جس قدر غور کرتا تھا اُتنا ہی میرا دماغ معطل ہو رہا تھا۔ اگر کسی ماہر نفسیات سے پوچھا جائے تو وہ اس کو ایک "اجتماعی طیف" (COLLECTIVE HALLUCINATION) بتا دے گا لیکن یقین مانیے میں بھی فلسفہ اور نفسیات میں دخل رکھتا ہوں۔ میں نے بھی اس واقعہ کو یہی سمجھ کر ٹالنا چاہا۔ لیکن اس سے میری تسکین نہ ہوئی۔ اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوسرے دن شاہد کی لاش "کودوا" میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔

(۴)

عام طور پر مشہور ہے کہ شاہد نے خودکشی کر لی اور ڈوب کر مرا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں لوگوں کے اس خیال کو رد کرنے کی کوشش کروں اس لئے چُپ رہا۔

بہت دنوں بعد میری ایک دوست سے ملاقات ہوئی جس کا نام نسیم تھا۔ اُن کو "روحانیات" میں بڑا دخل تھا۔ میں نے اُن سے اس واقعہ کو من و عن بیان کیا تو اُنہوں نے کہا "ایک دن میں تمہارے گاؤں پر چلنا چاہتا ہوں اور ایک رات

اُس مکان میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ اس عقدہ کو حل کر لوں گا" میں فوراً راضی ہو گیا۔

نسیم ایک رات اُس مہیب مکان میں رہا۔ صبح کو ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "میں نے رات اُس سبز پری سے خوب باتیں کیں۔ اس نے مجھے تمام راز سے آگاہ کر دیا۔ اور وہ مختصراً یہ ہے:۔

شاہد کے مورث اعلیٰ اورنگ زیب کے زمانہ سے اس گرد و نواح میں راج کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ جائداد اُن کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں جانے لگی۔ یہاں تک کہ شاہد کے دادا کو یہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ یہ مکان اب سے آٹھ پشت پہلے کی عمارت ہے، جس نے اس کو بنوایا اس کا نام "رشید" تھا۔ شاہد براہ راست رشید کی اولاد میں سے تھا۔ رشید اپنی پھوپھی کی لڑکی "بلقیس" پر فریفتہ تھا، بلقیس بھی اس کو پوجتی تھی، لیکن مرد اور عورت کا فرق آخرکار نمایاں ہو گیا۔ رشید نے دوسری عورت سے محبت شروع کی اور پھر اُس سے شادی کر کے اس مکان میں رہنے لگا۔ لیکن بلقیس کے دل سے رشید کی محبت نہیں گئی، وہ ارادے کی پوری تھی، اُس نے سارے خاندان کی مخالفت کی ہمسایوں کی مطعون بنی۔ مگر شادی نہیں کی اور مرتے دم تک رشید کا غم لئے رہی۔ شاہد کی "سبز پری" یہی بلقیس ہے۔ رات اس کی کیفیت قابل دید تھی۔ اس کا بیان ہے کہ یہ غم اب تک اُس کی روح سے لپٹا ہوا ہے، اور اسی غم کی بدولت اس کا رشتہ اس دنیائے عناصر سے قائم ہے۔ رشید تو اب اُس کا ہو نہیں سکتا اس لئے کہ وہ بلقیس کے ساتھ دغا کر چکا تھا اور اس کی روح ناپاک ہو چکی تھی۔ بیچاری کو زیر خاک بھی اسی طرح خورش میں مبتلا رہنا پڑا۔ یہاں تک کہ شاہد پیدا ہوا۔ شاہد نے ہو بہو رشید کی صورت پائی تھی۔ بلقیس نے اس وقت تک اُس کو مبتلا کرنا مناسب نہیں سمجھا

جب تک کہ شاہد میں خود عشق اور حُسن شناسی کا ذوق نہ پیدا ہو جائے۔
جب وہ وقت آ گیا تو اُس نے شاہد کو اپنی محبت میں گرفتار کر کے اپنی خوں شدہ حسرتوں کو آسودہ کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی۔
رات بلقیس کے ساتھ تمہارے شاہد سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش و خرّم نظر آ رہا تھا، اور ہم لوگوں کو اس کے لئے پریشان نہ ہونا چاہئے۔
نسیم سے یہ روداد سُننے کے بعد میں نے رفتہ رفتہ آس پاس کے دیہاتوں میں اس کی تحقیق شروع کی اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچا کہ نسیم نے جو کچھ بیان کیا وہ تاریخی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔

سنہ ۱۹۲۹ء

حسن شاہ

عشق را گویند قسمی از جنون

استعذ باللہ مما یفترون

(رومی رح)

حسن شاہ

یہ اس زمانہ کا قصّہ ہے جبکہ زندگی سے میری طبیعت اچاٹ ہو رہی تھی اور دنیا میں مجھے کوئی دلچسپی کی چیز نظر نہیں آتی تھی، یہاں تک کہ کتب بینی جو کبھی میرے لئے سب سے بڑی راحت تھی اب کوئی خاص دلکشی یا سامان مسرت اپنے اندر نہ رکھتی تھی۔ محبت میں مجھ کو مایوسی ہوئی تھی۔ جن جذبات کو میں قابل احترام سمجھتا تھا اُن کی نہ صرف توہین کی گئی تھی بلکہ وہ ٹھکرا دئے گئے تھے سبھے معلوم ہو چکا تھا کہ جس "ریحانہ" کو سمجھ رہا تھا کہ مجھے چاہتی ہے اور میرے واسطے بیتاب رہتی ہے وہ دراصل میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ عمر میں مجھ کو پہلا دھکا لگا تھا۔ زمانہ نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دُنیا میں تلخی اور مایوسی بھی کوئی چیز ہے۔

بہرحال اُن دنوں میں اپنے کاروبار کو چھوڑ کر اپنے گانوں میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ میں اپنا وقت بیکاری اور تعطل میں گزارتا تھا مگر اتنا مجھے احساس ہے کہ اُس زمانہ میں جو کچھ کرتا تھا وہ محض اپنے دل کے وقتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بلا کسی ارادہ یا مقصد کے کرتا تھا۔ میں صبح سے دور دور مارا مارا پھرتا تھا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ شام کے وقت پانچ پانچ اور چھ چھ کوس کی خاک چھان کر گھر واپس ہوا ہوں مجھے اپنے معمولات زندگی کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ غرضکہ کچھ عجیب بے دماغی اور بے دلی کا عالم تھا۔

ایک روز شام کو تقریباً چار بجے میں حسب دستور "جادہ پیمائی" کی غرض

سے چلا اور کوئی سات میل دریا کے کنارے نکل گیا مئی کا مہینہ تھا، ہوا رکی ہوئی تھی، دریا کی سطح اس قدر ہموار اور غیر متحرک تھی کہ معلوم ہوتا تھا دور تک شیشہ کا فرش بچھا ہوا ہے جس میں چاند اور ستاروں کا عکس ایک خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر بھی ایسے پرسکون سماں کا اثر ہوا۔ اور میں ایک صاف ستھری جگہ تجویز کر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یوں ہی گزری ہوگی کہ دفعتاً پیچھے سے ایک خوفناک شور سنائی دیا اور میرے قریب ڈھاک کا جو درخت تھا اس کے پتے ہلنے لگے۔ میں نے مڑ کر جو دیکھا تو مغربی اُفق بالکل سیاہ تھی اور یہ سیاہی سرعت سے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے آندھی اور پانی کا ایک ہولناک طوفان شش جہت پر مسلط ہوگیا۔ اب مجھے پورا احساس ہوا کہ میں گھر سے بہت دور ہوں۔ جلدی میں مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ قریب ہی ایک گڈھے میں جا کر چھپ رہا۔ انسان ہمیشہ جان ہی کے خوف سے سراسیمہ نہیں ہوتا بعض چیزیں بجائے خود ایسی ہوتی ہیں کہ مضبوط سے مضبوط اور قوی سے قوی دماغ پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ منظر بھی ایسا ہی تھا کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ورنہ میں اس سے پہلے بھی ایسے ویرانہ میں خطرات سے کچھ محفوظ نہ تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک تو یہ طوفان نوح اس طرح برپا رہا کہ دل کہتا تھا قیامت اگر آج نہیں آئی تو کبھی نہ آئے گی معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کائنات سے برہم ہو کر حشر و نشر پر تل گئی ہے یہاں سے وہاں تک نہ جانے کتنے درخت زمین پر لیٹ گئے تھے۔ میں نے جس گڈھے میں پناہ لی تھی وہ ڈالیوں اور پتوں سے بھر گیا تھا اور پانی اس میں کمر تک جمع ہوگیا تھا۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو میں وہاں سے نکلا، میرے کپڑے بالکل بھیگ گئے تھے۔ میرا مکان بہت دور تھا، راستہ ایسا نہ تھا کہ وہاں تک آسانی سے پہنچ سکتا۔ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتفاق سے دو تین فرلانگ پر ایک

بستی دکھائی دی اور میں ٹھوکریں کھاتا ہوا اسی سمت روانہ ہوا۔

گانوں میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک جُلاہے کا گھر ملا جہاں برآمدہ میں کئی آدمی جمع تھے اور اسی آندھی پانی کی باتیں ہو رہی تھیں، کسی کی جھونپڑی اُڑ گئی تھی کسی کے آم اور مہوے کے درخت اُکھڑ گئے تھے۔ کسی کا مکان گر گیا تھا، غرضکہ عجیب اُچھل مچی تھی۔ میں بھی رات کاٹنے کے لئے اسی مکان میں پہونچا، میرا استقبال کچھ اس انداز سے کیا گیا گویا میرا انتظار پہلے سے ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر میں صاحب خانہ نے ایک سن رسیدہ آدمی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"ہمارے حسن شاہ نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ایک آفت کا مارا یہاں پناہ لینے آ رہا ہے۔ ان کی یہی عادت ہے، کبھی کبھی غیب کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں۔"

حسن شاہ کا نام میں بچپن سے سنتا آیا تھا، وہ گرد و نواح میں مجذوب مشہور تھے۔ میں مجذوب کو پاگل سمجھتا تھا، اس لئے کہ "عشق الٰہی" کا کوئی خاص مفہوم میرے ذہن میں نہیں۔ یہاں تک تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ کوئی شخص دنیا کی کسی چیز کو غلوئے جذبات میں اللہ یا معبود مان کر پوجنے لگے۔ لیکن یہ براہ راست "اللہ میاں" سے عشق میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا۔

بہرحال حسن شاہ کو لوگ "اللہ والا" کہتے تھے اور دُور دُور سے معتقدین اُن کے پاس مُرادیں لے لے کر آتے تھے۔ مجھے اُن کے حالات زیادہ معلوم نہ تھے۔ اتنا سُنا تھا کہ پہلے وہ کوئی بڑے زمیندار تھے۔ جب سے وہ "جامۂ خرد" سے عاری ہوئے اُن کی ساری جائداد اُن کے رشتہ داروں کے قبضہ میں چلی گئی۔ صرف اُن کا وسیع مکان جو لبِ دریا واقع ہے اُن کے پاس بڑی مشکل سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اب وہ صاحب جذب و کمال ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ سُنکر بڑا لطف آیا کرتا تھا کہ وہ اپنے مریدوں کو دعا کے بجائے بد دُعا دیتے ہیں اور بغیر گالی کے کوئی بات نہیں کرتے

میں اس عجیب وغریب ہستی کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔

آج میں نے حسن شاہ کا نام سُنا تو ہمہ تن شوق و نیاز بن کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اُس نے بھی مجھے غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی جو کسی دوسری دُنیا سے حاصل کی گئی تھی۔ اُس کی داڑھی بے ربط طریقہ سے سینہ تک بڑھ گئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں کی رگیں اس طرح اُبھری ہوئی تھیں کہ دیکھنے والے پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ مجھے حسن شاہ پہلی نگاہ میں بھوت معلوم ہوا۔ حسن شاہ نے چند منٹ مجھے دیکھا اور پھر میرا داہنا ہاتھ زور سے پکڑ کر کہنے لگا۔ "تم آگئے! میں ایک مُدت سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کسی نہ کسی دن آکر میری داستان سنو گے، میرے ساتھ چلو میرے مکان میں تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

اُس کی گرفت میں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بڑی لگا دی ہے اور میرے تمام جسم میں بجلی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ میں ایسا ڈرا کہ اس کی بے ربط گفتگو پر حیرت بھی نہ کر سکا۔ مجمع برخاست ہوگیا، میزبان کہیں میرے لئے چارپائی لینے چلا گیا تھا۔ میں تنہائی میں حسن شاہ کے سامنے لرزہ براندام تھا اور وہ بھی مجھے پکڑے ہوئے تھا، گویا اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔ اتنے میں میزبان کی بیوی نکلی۔ اُس نے میری گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔ "گھبرائیے نہیں، یہ نہایت معصوم اور اللہ والے ہیں، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ البتہ پردیسیوں کے ساتھ ان کو نہ جانے کیوں بہت زیادہ لگاؤ رہتا ہے۔ یہ قریب کے ایک گانوں کے مشہور زمیندار ہیں، ان کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ ان کی شادی ہونے والی تھی۔ لیکن شادی سے ایک دن پہلے لڑکی کو سانپ نے کاٹ لیا اور کچھ دنوں بعد یہ مجذوب ہوگئے....."

حسن شاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس خوبصورت عورت پر آنکھیں نکال کر

بولا "مجذوب تیرے باپ ہوں گے، ساٹھ سال کی عمر تیری ہوگی، سانپ نے تیرے شوہر کو کاٹ لیا ہوگا، اور سنیئے! کل میری شادی ہوگی، گانا بجانا ہو رہا ہے، اور کمبخت کہتی ہے سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے، تیری زبان سڑ جائے۔" مجھے بیساختہ ہنسی آگئی، میزبان کی بیوی نے میرے کان میں جھک کر کہا "ذرا ان سے پوچھئے کہ ان کی عمر کیا ہے۔" میں نے پوچھا تو جواب ملا "۲۵ برس۔" اب میری دہشت دور ہوگئی اور مجھ پر عبرت چھاگئی۔ میزبان کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے یہ دیکھ کر حسن شاہ جلدی سے اٹھا اور اُس کے آنسو پونچھ کر کہنے لگا "یہ کیا؟ آنسو انسان کو بری طرح غارت کر دیتے ہیں۔" اور پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "انہیں آنسوؤں نے میرے اس حصہ کو جلا کر سیاہ کر ڈالا ہے، جب میں کسی کو روتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک بات یاد آجاتی ہے جس کو میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہے۔"

حسن شاہ یہ کہہ کر چپ ہوگیا اور بیٹھ کر سوچنے لگا، چند لمحے بعد آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "بے شک ساٹھ برس! بڈھا ضعیف، ناکارہ، اپنے ہوش میں نہیں، لڑکوں کا کھلونا، تم لوگوں کا مجذوب، دُنیا میں تنہا بے یار و مددگار۔" اس نے اپنا سر اپنے زانوؤں میں چھپا لیا۔ میزبان کی بیوی نے متحیر ہو کر کہا۔ "ان کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے آج تک کسی نے نہیں سُنا تھا۔ یہ تو اب اپنے حواس میں معلوم ہوتے ہیں۔"

میں اب حسن شاہ سے مرعوب نہ تھا۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے کہا "تم روتے کیوں ہو؟ کل تو تمہاری شادی ہونے والی ہے اور تم بدشگونی کر رہے ہو؟ خوشیاں مناؤ اور اپنی قسمت پر ناز کرو کہ سعیدہ کے ساتھ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

حسن شاہ یک بیک پھر شگفتہ ہوگیا اور اُس کے خیالات کا سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا

پھر مل گیا، اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"اسی وجہ سے تو کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو، رات بھر تم کو قصے سناؤں گا، کل تم میری شادی میں شریک ہونا"۔ میں اُس کے ساتھ جانے کا پورا ارادہ کر چکا تھا، مگر پھر اُسی عورت نے کہا حسن شاہ اِن کو کل لے جانا، آج یہ بہت تھک گئے ہوں گے"۔ حسن شاہ نے ڈانٹ کر کہا"۔ پاگل تو نہیں ہوئی ہے، کل میری شادی ہے۔ سب کے سب اہتمام میں مصروف ہوں گے ان سے قصے کون بیان کرے گا؟" یہ کہکر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

طوفان ختم ہو گیا تھا مگر طوفان کے آثار باقی تھے، زمین دلدل ہو رہی تھی، جا بجا درخت اُکھڑے پڑے تھے، ہم لوگ جنگل جھاڑی اور مختلف رکاوٹوں کو طے کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے حسن شاہ خاموش تھا، تقریباً آدھے میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک اور گانوں ملا، حسن شاہ نے مڑ کر کہا"۔ یہ میرا گانوں ہے، اس کی مشرقی سرحد پر سب سے الگ دریا کے کنارے میرا مکان ہے"۔ کچھ دور جا کر وہ مکان بھی ملا جو اپنی کس مپرسی کا اعلان خود کر رہا تھا۔ احاطہ کی دیواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ جو حصہ کبھی باغ رہا ہوگا وہ جنگل ہو گیا تھا، دیواروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔

حسن شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا"۔ اب یہ ویرانہ ہو رہا ہے کبھی زمانہ میں یہ بہشت بنا ہوا تھا۔ برآمدہ میں ایک طرف پیال بچھا ہوا تھا جس پر ایک میلا، پھٹا ہوا بستر پڑا تھا۔ اُس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا میں اسی پر سوتا ہوں، لیکن تمہارے لئے پلنگ ہے، مہمان کے خیال سے میں ایک پلنگ ہمیشہ رکھتا ہوں"۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر وہ جلدی سے کمرے میں گھس کر پلنگ لے آیا اور میرے شانوں پر پورا زور دیکر اُس پر بٹھا دیا، جنوں بھی عجیب چیز ہے۔ اس کی ماہیت نہ تو آج تک اطبّا کی سمجھ میں آئی نہ ماہرین نفسیات کی اور سچ تو یوں ہے

کہ سمجھ میں آنے والی بات بھی نہیں۔ سمجھ میں صرف وہ باتیں آسکتی ہیں جن میں کوئی نظام ہو، کوئی ترتیب ہو، کوئی ربط ہو، جنوں میں اگر کوئی ترتیب یا ربط ہوتا تو اس کا نام جنون ہی کیوں پڑتا۔ جنون کی ماہیت کچھ صاحب جنون ہی جان سکتا ہے۔ حسن شاہ ہر کام عقل و ہوش کے ساتھ کرتا تھا، پھر اس کے کیا معنی کہ وہ اپنے کو پچیس سال کا سمجھ رہا تھا اور اس دھوکے میں تھا کہ کل اس کی شادی ہونے والی ہے؟ دنیا اگر اس کو دیوانگی سمجھتی ہے تو سمجھے "ہوش و خرد" والے اس کو دماغ کا فتور کہتے ہیں تو کہیں، میں تو اس کو حسن شاہ کی ایک زبردست قوت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنے لئے زمانہ کو گردش سے روک نہیں لیا تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ زمانہ کی گردش کو اپنے ارادہ کے زور سے الٹنا چاہتا ہو؟ جذبات کیا نہیں کرسکتے؟ محبت کون سا کرتب نہیں دکھا سکتی؟ اگر اس کی بدولت انسان پاگل ہوسکتا ہے تو یہ بھی کچھ محال نہیں کہ محبت کرنے والا زمین و زمان کی رفتار کو یک قلم روک دے۔ حسن شاہ کے دل و دماغ نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ اس کی سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اس نے اپنی تمام قوتیں اس کوشش میں صرف کردیں کہ اس کا "کل" کبھی نہ آئے۔ اور اس کی عمر پچیس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ یہ باتیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں اور نہ ان کے لئے کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔ میں تو اپنی جگہ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ:۔

"ایں ہم اندر عاشقی در حیطۂ امکاں بود"

ممکن ہے معترض کہے کہ دنیا تو حسن شاہ کو ساٹھ برس کا دیکھ رہی تھی اور ان واقعات کو ترتیب وار دیکھ رہی تھی جو اس کی دیوانگی کا باعث ہوئے تھے۔ اس کا جواب بہت سیدھا سا ہے حسن شاہ کے لئے اس کی عمر پچیس سے آگے کبھی نہیں

بڑھی اور نہ کبھی وہ گھڑی آئی جس میں سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ باقی روزمرہ کے جو واقعات تھے وہ اس کے پچیسویں برس میں گزر رہے تھے۔ اتنا تو میں کیا سیکڑوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ حسن شاہ غیر معمولی قوتوں کا انسان ہے جس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ وہ اکثر صحیح پیشین گوئیاں کر دیا کرتا تھا، اور بعض اوقات تو سنا گیا ہے کہ اس کو ایسی ایسی چیزوں کا علم ہو گیا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ اُس کے دروازے پر مریدوں کا جو مجمع رہتا تھا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تنہا میں ہی اس کی قوتوں کا قائل نہ تھا۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ کہنا صرف اتنا تھا:۔

ہزار جلوہ در آغوش بے خودی محو است ۔۔۔ جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب

حسن شاہ نے اپنی ساری "جنس شعور" لٹا کر "خواب کی دولت" حاصل کر لی تھی اور مطمئن ہو گیا تھا۔

مجھے پلنگ پر بٹھا کر اُس نے ایک چراغ جلایا اور خود زمین پر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی زمین پر بیٹھنا چاہا مگر اُس نے صرف ایک نگاہ سے مجھ کو روک دیا۔

"ہاں تو میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔" حسن شاہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

اُس کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔ میں چراغ کی دھندلی روشنی میں دیکھ رہا تھا کہ کبھی وہ آگ کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے اور کبھی خزاں رسیدہ پتّی کی طرح زرد، وہ کسی شدید آزمائش سے گزر رہا تھا، کسی جانکاہ تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اُس پر ہوش و حواس اپنا غلبہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا

"کہو حسن شاہ! تم کس عالم میں رہا کرتے ہو، اور تم پر کیا گزرا کرتی ہے؟ تم نے مجھ سے کون ما قصہ بیان کرنے کو کہا تھا؟"

حسن شاہ نے میرے سوال کا جواب تو دیا نہیں اور نہ جانے کون سی دھن میں کہنے لگا۔ "دیکھو اگر تم کو کبھی محبت میں ناکامی اور مایوسی سے سابقہ پڑے تو اپنی زندگی کو بھول جانے کی کوشش کرنا اور پھر تمہیں کوئی دُکھ نہ ہوگا۔ یہ سارا قصور آدم کا ہے ذرا سی لغزش کر کے سب کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ یہ آنی اور فانی زندگی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، وہ نہ اس دنیا میں آتا نہ موت اور زندگی میں کوئی امتیاز ہوتا۔ خلود و ابدیت سے خود محروم ہو گیا اور سب کو محروم کر دیا۔ اُس کو جہاں تک کوسنے دیئے جائیں بجا ہیں۔"

حسن شاہ بے ربطی کے ساتھ پھر چپ ہو رہا، اس کی صورت اس وقت حسرت انگیز تھی مجھے ہنسی بھی آگئی اور رونا بھی، اپنا قصہ سنانے کا وعدہ تو بھول گیا ہی تھا مجھے جو محبت کے متعلق مشورے دیئے جا رہے تھے، وہ بھی پورے نہ ہوئے اور آدم کو کوسنے دیئے جانے لگے۔ کوئی ربط سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں اس وقت اپنی ذاتی محرومی کی داستان بھول گیا تھا اور اس انوکھے بڈھے میں محو ہو گیا تھا۔

ایک بج چکا تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اصل قصہ کی طرف رجوع کرے لیکن اُس کے خیالات کی عجیب رفتار تھی۔ کبھی وہ اپنے سر کو زور سے ہلانے لگتا اور کبھی کچھ پڑھنے لگتا۔ مجھے اتنی دیر میں معلوم ہو گیا کہ وہ فارسی و عربی کا ماہر ہے۔ وہ مجھے کئی بار قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر مع تفسیر کے سُنا چکا تھا، میں گھبرا گیا تھا، لیکن اس کو نہ بے جا چھیڑنے کو جی چاہتا تھا نہ چھوڑنے کو، کئی منٹ سے حسن شاہ فضا میں نگاہیں جمائے ہوئے کچھ غور کر رہا تھا۔ یکایک اپنے سر کو ایک جھٹکا دے کر کہنے لگا "کچھ نہیں اب میں دوسرے خدا کی تلاش کروں گا، یہ خدا تو جبّار و قہّار ہے، سوا دل آزاری کے کچھ نہیں جانتا۔"

میرے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ آج تک کسی کی زبان سے ایسی باتیں نہیں

سکی تھیں، میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے خیالات کا مرکز پھر بدلا۔ اُس نے ایک دردناک آہ کر کے کہا۔ "آج میرے دماغ میں ایک غیر معمولی جلن ہو رہی ہے، میرے دل میں نہ جانے کیسی ہوکیں اُٹھ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک نئی زندگی شروع کر رہا ہوں جس میں دکھ ہی دکھ ہے!"

مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے حواس میں بیداری شروع ہو رہی ہے۔ میں نے امتحاناً پوچھا۔ "تو کل تمہاری شادی ہونے والی ہے؟" بس کہہ نہیں سکتا کہ میرے اس سوال سے اُس کی کیا حالت ہوئی۔ اس کی رگیں اینٹھنے لگیں، آنکھیں سُرخ ہو گئیں، اُس کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی مخالف قوت سے زور آزمائی کر رہا ہے میں پریشان ہونے لگا، اس لئے کہ اس کو سب کچھ یاد آگیا تھا، واقعات کی دنیا اُس کی اپنی دنیا کے خلاف صف آرا ہو گئی اور وہ اپنی دنیا کو درہم برہم ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا، ایسے صدمہ کو کوئی یکبارگی نہیں برداشت کر سکتا۔ مجھے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں اس کا کام تمام نہ ہو جائے وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا تھا، اُس کے آنسو گرنے لگے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر کیا تدبیر اختیار کروں۔ خیریت ہوئی کہ وہ خود بخود مجھ سے مخاطب ہوا اور گویا قضا و قدر کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے کہنے لگا:۔

"نہیں عزیز من! میری سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا، وہ مر گئی اور مجھے اکیلا زندگی کی تلخیاں برداشت کرنے کے لئے چھوڑ گئی، اس کو ۳۵ برس کا زمانہ ہو چکا۔ لیکن آخر میں اتنے دنوں تک کہاں تھا؟ یہ بیچ میں خلا کیوں ہے؟ اچھا ٹھیک ہے!......"

حسن شاہ کے دماغ میں درستی پیدا ہو چلی تھی، آہستہ آہستہ اُس کے خیالات میں ترتیب پیدا ہو رہی تھی، ایک ایک کر کے اس کو سب باتیں یاد آ رہی تھیں، اُس کے ریشہ ریشہ میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ اور اب اُس پر ایک قیامت گزر رہی

تھی ، جس کا وہ پوری کوشش کے ساتھ مقابلہ کر رہا تھا۔ دیر کے بعد جب اس کے حواس کسی قدر مجتمع ہوئے تو اُس کو میں یاد آیا۔ اور اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا :۔ تم میری وجہ سے بڑی کشمکش میں ہو ، مجھے معاف کرنا ، آج خدا جانے مجھ کو کیا ہو گیا ہے ، ہاں ٹھیک ہے ، سعیدہ مر گئی ہے ، اور میں ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گیا ہوں ، اب کس سہارے پر زندہ رہوں۔ خیر! میری داستان سنو! جس کے تم دیر سے منتظر ہو "

"میرا باپ بڑا دولت مند تھا ، اُس کو حسین چیزوں کا بڑا شوق تھا ، اُس کی حسن پرستی اور رچے ہوئے مذاق کی بیّن دلیل یہ ہے کہ اُس نے بھرا ہوا گانوں چھوڑ کر یہاں جنگل میں اتنی عالی شان عمارت تعمیر کرائی ، وہ مجھے بہت چاہتا تھا اور بڑے ناز و نعم کے ساتھ رکھتا تھا۔ میں گانوں کے دیہاتی لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلنے پاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں تنہائی پسند ہو کر رہ گیا۔ میری تنہا رفیق میری خالہ زاد بہن سعیدہ تھی جس کے ماں باپ مر گئے تھے ، وہ اسی مکان میں رہتی تھی اور بچپن سے میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ اُس کو بھی اسی قدر تعلیم دی گئی تھی جتنی کہ مجھ کو ، ہمارا مذاق طبیعت یکساں تھا اور ہم ایک دوسرے کے لئے جان دینے کو تیار رہتے۔ ہم ایک ساتھ اِسی دریا کے کنارے کھیلا کرتے تھے اور باغ کے پھول چھوڑ کر جنگل کے خودرو پھول چُنا کرتے تھے ، فطرت کی ستم ظریفی دیکھنا دریا اسی طرح رواں ہے اس میں سر مو فرق نہیں آیا ، جنگل اور جنگل کے پھول جیسے اب سے بیس سال پیشتر تھے ویسے ہی اب بھی ہیں ، وہی پرندے وہی چرندے جن کو دیکھ دیکھ کر ہم خوش ہوا کرتے تھے آج تک اسی طرح موجود ہیں ، فاختوں کے وہی جوڑے آج بھی اس سرزمین کو اپنی محبت کی جولاں گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن سعیدہ نہیں رہی ، نہ جانے کس عالم میں ہے اور کیا کرتی ہے ، اور میں ساٹھ برس کا ایک بڈھا دیوانہ!

نہ کسی چیز میں لذت پاتا ہوں نہ کہیں جی لگتا ہے۔ یہ بھی نہیں خبر کہ اتنی طویل مدت کیونکر گزر گئی۔ سعیدہ کو مرے ہوئے برسوں گزر گئے اور میں جی رہا ہوں! یہ کیسے ممکن تھا؟ کیا سعیدہ کی مجھ کو محبت نہیں رہی؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ سعیدہ! میں تجھے بھولا نہیں ہوں، ممکن ہے تو اپنی نئی دلچسپیوں میں مجھ کو بھول گئی ہوگی، مگر یہاں تو وہی پرانی چیزیں ہیں جو ہر دم پرانی یادیں تازہ کرتی رہتی ہیں، پھر تجھ کو فراموش کرنا کیسے ممکن ہے؟"

میں نے دیکھا کہ حسن شاہ پھر بہک چلا اور اب شاید جلد اصل بات کی طرف نہ پلٹے۔ اس لئے میں نے بات کاٹ کر پوچھا: "تو تمہاری سعیدہ کو ہوا کیا؟"

"ہاں تو سنو!" حسن شاہ نے چونک کر جواب دیا "میں سعیدہ سے پانچ برس عمر میں بڑا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تو اس کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کی دنیا میں اس کے پیارے حسن کے علاوہ بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ قدرت کی نت نئی رنگینیاں، یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند اور سورج، یہ خودرو پھول، یہ دریا کی ترنم ریز لہریں، سب میری ہی ذات کے طفیل سے وجود میں آئے ہیں۔ میں بھی اپنی دنیا اسی تک محدود سمجھتا تھا۔ میرا اعتقاد تھا کہ جس دن سعیدہ نہیں اس دن دنیا نہیں، سعیدہ کی وفا آموز آنکھیں مجھے درس محبت میں ماہر کر رہی تھیں، جس وقت وہ مجھے پیار کی نگاہوں سے دیکھتی تھی، مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ زندگی نام ہے صرف انھیں نگاہوں کا، اگر یہ نگاہیں نہیں تو زندگی نہیں۔ یہ کوئی شاعرانہ پرواز تخیل نہ تھی۔ بلکہ میرا دین وایمان یہی تھا۔ مختصر یہ کہ میں سعیدہ سے برطرف ہو کر زندگی کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ میری عمر کا تئیسواں سال شروع ہوا اور میرے لئے قیامت کے آثار شروع ہونے لگے، یعنی سعیدہ کے لئے بر کی تلاش ہونے لگی۔ لوگوں کو فکر ہو گئی کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے اب

اس کو کہیں کھپا دینا چاہئے۔ گویا کہ اب تک اس کی کھپت نہیں ہوئی تھی۔ یہ انقلاب میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تھا۔

سعیدہ آزردہ رہنے لگی تھی اور اب اُس میں وہ اگلی سی باتیں نہ تھیں۔ مجھے واہمہ بھی نہ تھا کہ محبت کو مستحکم اور پائیدار کرنے کے لئے ایسے لغو اور بے بنیاد رشتہ کی ضرورت ہوگی۔ کچھ دنوں تک تو میں اپنی اور سعیدہ کی محبت کو قائم رکھنے کی مختلف بیکار تدبیریں سوچتا رہا۔ یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرے باپ میں باوجود علوئے تخیل اور عشرت پسندی کے دُنیوی عزوجاہ اور دولت و ثروت کا لالچ ہے۔ سعیدہ غریب کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو دنیا کی نگاہ میں ہماری موجودہ شان و شوکت کو بڑھا سکتی، اس لئے میرے باپ مجھے کسی امیر اور معزز خاندان میں بیاہنا چاہتے تھے، ابھی تک مجھ سے استمزاج نہیں لیا گیا تھا۔ میں عجیب کشاکش میں تھا۔ میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ کسی طرح باپ سے صاف صاف اپنے دل کی حالت بیان کردوں۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سعیدہ کے لئے خاوند تلاش کر رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ سعیدہ نے مجھ سے ملنا کم کر دیا تھا اور جب ملتی تھی تو میں اُس کے حرکات و سکنات میں تصنع کا شائبہ محسوس کرتا تھا۔"

حسن شاہ خلاف توقع پھر رک گیا۔ اور فضا میں نہ جانے کس چیز کو دیکھنے لگا میں نے بھی اس کے "سکوتِ بے محل" میں خلل انداز ہونا نامناسب سمجھا اور صبر کے ساتھ اس کے پھر ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ خاموش رہ کر اس نے خود بخود بلا کسی تحریک کے سلسلہ شروع کیا۔

"آخر کار میں ضبط نہ کر سکا اور اپنے باپ کے پاس ایک مختصر سی تحریر بھیج دی "سعیدہ کی شادی مجھ سے ہونی چاہئے۔ اگر وہ کسی غیر کی گود میں دی گئی تو پھر دریا کی بے شمار موجوں میں میرا پتہ بھی نہ لگے گا" ہر طرف ایک شورش پھیل گئی، کسی کو

مجھ سے ایسی اُمید نہ تھی، باپ نے مجھے بلا کر سمجھایا، ترشروئی کے ساتھ باتیں کیں، دھمکیاں دیں مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا، میرا ارادہ زور پکڑ چکا تھا، میں اپنی بات پر اڑا رہا، باپ مجھ پر جان دیتا تھا اس لئے اس کو شکست ہوئی۔ اور سعیدہ مجھ سے منسوب ہو گئی مگر یہ سب کہیں خواب تو نہیں تھا؟......"

اُس کے خیالات پھر پریشان ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے کہا "پھر کیا ہوا؟" حسن شاہ نے جواب میں کہا:۔

"میں اپنے قصہ کو بے کار طوالت نہیں دے رہا ہوں، اس سے تم میری پوری زندگی کی سرگزشت سمجھ لوگے۔ گھر والوں نے مجبور ہو کر یہ طے کر لیا کہ ڈیڑھ سال بعد سعیدہ عمر بھر کے لئے میری ہو جائے گی۔ دونوں کلیاں جو مرجھا رہی تھیں پھر شگفتہ ہو گئیں۔ سعیدہ پھر رگوں میں زندگی کی لہریں محسوس کرنے لگی۔ اور میں تو گویا دوبارہ پیدا ہوا۔ لیکن اس کے بعد ہم کو ایک دوسرے سے ملنا نصیب نہیں ہوا۔ سعیدہ رسم کے مطابق مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت ہم نے جن بے چینیوں میں بسر کی اُن کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ ہمارے جینے کا بہانہ صرف یہ اُمید تھی کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے کی آغوش میں پہونچ جائیں گے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال ختم ہونے کو ہوئے، بیاہ کی تیاریاں شروع ہوئیں، گانا بجانا شروع ہونے لگا، خوشیاں منائی جانے لگیں۔ میں خود ہر کام میں سرگرمی کے ساتھ نمایاں حصہ لے رہا تھا۔ میرے لئے کائنات پر ایک نیا رنگ پھر رہا تھا۔ سعیدہ کے لئے "حجلۂ عروسی" تیار ہو رہا تھا......اور اس کے بعد کیا ہوا؟"

میں نے فوراً کہا "ہاں بتاؤ کیا ہوا؟" حسن شاہ نے غور کرتے ہوئے کہا:۔

شاید میں پاگل ہو گیا۔ مجھے پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر سعیدہ سے

تم نے شادی کا پیغام دیا تو وہ مرجائے گی اور تم پاگل ہو جاؤ گے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ بچپن ہی سے مجھ پر کبھی کبھی ایک خواب کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی جس میں بلا کسی ظاہری توسط کے مجھ کو ہونے والی بات کا علم ہو جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر جن یا پری کا سایہ ہے۔ باپ کو وہ منحوس تحریر روانہ کرنے سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ میری سعیدہ کو ایک کالے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ مگر میں متنبہ نہ ہوا، محبت نے مجھے اندھا بنا رکھا تھا، میں نے اس کو واہمہ سمجھ کر دل سے نکال دیا۔ اُف محبت بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ میں نکاح کا پیغام نہ دیتا تو سعیدہ آج اس دنیا میں ہوتی اور میں بھی شاید اس حالت کو نہ پہنچتا۔ سعیدہ تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی، میری برباد زندگی کی تجھ کو ذرا پروا نہیں۔

"من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونہٗ"

حسن شاہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا "کیا قصہ پورا ہو گیا؟" یہ سُن کر وہ سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے حافظہ پر زور دے رہا ہے۔ سوچتے سوچتے اُس نے ایک قہقہہ لگایا، اس قہقہہ نے میرا دل دُکھا دیا۔ حسن شاہ نے اپنی بے ہنگام ہنسی قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! اس کے بعد میں دیوانہ اور مجذوب سمجھا جانے لگا۔ دنیا والے ہر بات میں اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ اب بعض مجھے ولی اور بزرگ کامل سمجھتے ہیں اور بعض مجنوں اور فاتر العقل، سچ ہے جس کو دنیا کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو وہ دنیا کے خیال سے دیوانہ ہی ہے۔ مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ لوگ مجھے اب بھی چین نہیں لینے دیتے اور خواہ مخواہ آکر پریشان کرتے ہیں۔ میں گالیاں دیتا ہوں، صلواتیں سُناتا ہوں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ میرے معتقدین اسی میں اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔ ہر جگہ یہ مشہور ہے کہ میری بد دعاؤں کا اثر اُلٹا ہوتا ہے۔

خیر! اب قصہ بہت مختصر ہے، اُسے بھی سُن لو۔ سعیدہ اب بھی مجھ سے غافل نہیں ہے، وہ مجھے گاہے گاہے خط بھیجا کرتی ہے اور تسلیاں دیا کرتی ہے۔ میں جاکر اُن کو لاتا ہوں اور چند منتخب کر کے تم کو دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر ایک کمرہ میں گیا اور ایک بوسیدہ صندوقچی اٹھا لایا۔ جس میں بہت سے کرم خوردہ خطوط بے ترتیبی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ حسن شاہ نے مجھ کو ایک تحریر دی اور کہا "پہلے اس خط کو پڑھو، یہ اُس وقت کا ہے جب کہ سعیدہ کی موت کے بعد مجھ پر وہ کیفیت اچھی طرح طاری نہیں ہوئی تھی جس کو سب دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں اور میرے والدین میرے دماغ کو دوسری طرف مائل کرنے کے لئے میری دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ میرے ماں باپ کو میری بڑی فکر تھی اور وہ بھی میرے ہی غم میں مر گئے۔"

میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:۔

"پیارے حسن! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم سعیدہ کو بھول گئے۔ جس کے لئے زندگی سے بیزار ہو کر ماں باپ سے بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے؟ کیا تمہیں یاد نہیں کہ خدا نے کس مشکل سے تم کو میرے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی تھی؟ میں یہ نہیں سکتی تھی کہ تم میرے ہوتے ہوئے کسی اور کو اپنے پہلو میں جگہ دو گے۔ میرا حسن اگر دوسرے کا ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی اور کیا کروں گی؟ نہیں نہیں ایسے مجھ کو نہ چھوڑو اور صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہو، دن کٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دن بھی آ ہی جائیگا۔ جب ہم ایک دوسرے سے مل جائیں گے اور پھر کوئی قوت ہم کو جدا نہ کر سکے گی

"تمہاری کنیز سعیدہ"

دوسرے خط میں بیتابی کا اظہار کیا گیا تھا:۔

"اب تشنگی ناقابل برداشت ہو رہی ہے، آخر یہ صبر آزما گھڑیاں گزر کیوں نہیں جاتیں؟ حسن تم کو میں کب دیکھوں گی؟........"

تیسرے خط کو پڑھ کر میں بے ساختہ رو دیا، صرف اس قدر لکھا تھا۔

کون سی رات آن ملے گا

دن بہت انتظار میں گزرے

"سعیدہ"

حسن شاہ نے جتنی تحریریں مجھے پڑھنے کو دیں سب ایسی ہی تھیں کہ واقعی کوئی دل والا اُن کی تاب نہیں لا سکتا تھا، پھر اگر بے چارہ حسن شاہ اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھا کہ سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ سب سے آخری خط میں لکھا تھا:۔

"شاباش حسن شاباش! تم بڑے پختہ مغز ہو، آئینِ وفا خوب نباہا، میں جب سوچتی ہوں کہ میرا چاہنے والا ایسا دُھن کا پکا ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی ہوں بس اب جدائی کا دور ختم ہو رہا ہے، گھبراؤ نہیں تم بہت جلد مجھ سے ملنے والے ہو، اللہ اللہ! ہجر کی یہ دراز مدت بھی کیسی کٹھن تھی؟"

"تمہاری منتظر سعیدہ"

اس خط نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔ میں اس کا مطلب سوچنے لگا۔ پندرہ بیس خطوط پڑھ چکا تھا حسن شاہ نے کہا:۔ "اب جانے دو سب ایسے ہی ہیں، تم بہت تھک گئے ہو گے خواہ مخواہ میری وجہ سے پریشان ہوئے۔ صبح ہو رہی ہے کچھ آرام کر لو۔"

یہ کہہ کر وہ اس طرح بیٹھ گیا گویا اب اُس کو کچھ کرنا نہیں تھا۔ اس وقت اُس کی بالکل وہی حالت تھی جو کسی عزیز کے جنازہ کی تجہیز و تکفین کے بعد ماتم داروں

کی ہوتی ہے، یعنی وہ ایک تکان محسوس کر رہا تھا جس نے اُس کے اعصاب کو ڈھیلا کر دیا تھا۔

چار بج چکے تھے، ہوا کی خواب آور کیفیت نے مجھ پر اثر کیا اور میں حسن شاہ کی صورت دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ایک نامعلوم خطرہ کے احساس سے میری نیند اُچٹ گئی۔ دیکھا تو حسن شاہ سامنے نہ تھا۔ اور اُس کے خطوں کی صندوقچی بھی غائب تھی۔ میں گھبرا کر اُٹھا اور سارا مکان چھان مارا۔ کہیں اُس کا پتہ نہ لگا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ احاطہ میں تلاش کرتا ہوا چہار دیواری سے باہر آیا اور ایک ٹیلہ پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ حسن شاہ مجھ سے بہت دور دریا کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا چلا جا رہا تھا، اس کی صندوقچی بھی تھی۔ میری جان سوکھ گئی، میں ٹیلہ سے کود پڑا اور پکار کر کہا "حسن شاہ! ذرا ٹھہرو ایک بات تو سنو"

اُس نے چلّا کر جواب دیا "میرے پیچھے نہ آؤ۔ میں اب کسی کی بھی نہیں سُن سکتا، میں اپنی سعیدہ سے ملنے جا رہا ہوں"

میں نے دوڑنا شروع کیا مگر بے کار۔ وہ ایک جگہ جہاں دریا بہت گہرا تھا رُکا اور صندوقچی کو لئے ہوئے دریا میں کود پڑا۔ میں اُس کو ڈوبتا دیکھ رہا تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ گاؤں والوں کو آواز دی، لیکن جب تک وہ آئیں حسن شاہ اپنی منزل مقصود کو پہونچ چکا تھا۔

رات بھر گھر والے میرے لئے پریشان تھے۔ ہر جگہ میری تلاش کی گئی۔ مگر میں نہ ملا لوگوں کے دلوں میں نہ جانے کیا اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ آٹھ بجے صبح کے قریب میں صحیح و سالم گھر واپس ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ کسی سے کچھ کہتا سنتا۔

میں نے کچھ کھا پی کر حسن شاہ کی سرگزشت پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ:۔

"اُس کی اس دردناک موت کا بہانہ میں ہوا ہوں، مجھے دیکھتے ہی اُس کے دماغ میں صحت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ اچھی طرح اپنے ہوش میں آگیا تھا، اُس کا جنون دور ہو گیا تھا، وہ اپنے خواب سے دفعتاً بیدار ہو گیا تھا، اُس کی "مجذوبیت" چھن گئی تھی، اور اس کی قوتوں نے جواب دے دیا تھا۔

اب وہ زمانہ کی گردش پر فتح نہیں پا سکتا تھا، اُس کی سعیدہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا، اور وہ اِس صدمے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا پینتیس برس کا زمانہ اُس پر سے چند گھنٹوں میں گزر گیا، اتنی مدت کا غم اتنے قلیل عرصہ میں برداشت کرنا حسن شاہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اور اس نے اس کا علاج سوا اس کے اور کچھ نہیں دیکھا کہ خود بھی سعیدہ کے پاس چلا جائے"

(۱۹۲۷ء)

محبّت کا جوگ

عقل در راہِ عشق نابیناست
عاقلی کارِ بوعلی سیناست

(حکیم سنائی)

محبت کا جوگ

میں کوئی ادیب نہیں ہوں، نہ میری علمی استعداد بہت زیادہ ہے اور نہ میں کسی خاص طرز انشا کا مالک ہوں۔ یہ عمر میں پہلی بار ہے کہ عوام کے سامنے اپنے حالات اور اپنی تحریر پیش کر رہا ہوں۔ مجھے واقعات کو ترتیب وار بیان کرنا بھی نہیں آتا اور پھر ایسے واقعات جو خود میرے ذہن میں کسی خاص ترتیب کے ساتھ موجود نہ ہوں۔ مجھے جو کچھ یاد ہے وہ خواب کی طرح یاد ہے، ممکن ہے میرے پڑھنے والے اِن اوراق میں کوئی دلچسپی کی بات نہ پائیں۔ لیکن میں اپنے واقعات کو بغیر قلمبند کئے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ اگر میرے وکلا نے مجھے دیوانہ اور فاترالعقل ثابت کر کے رہائی نہ دلوائی ہوتی تو انھیں واقعات کی بدولت عدم آباد کا رستہ لئے مجھے برسوں ہو گئے ہوتے۔ چھ سال تک میں بنارس کے پاگل خانے میں بند رہا اور مجھے وہاں سے چھوٹے ہوئے مشکل سے دو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ ڈاکٹروں نے اگرچہ مجھے صحت دماغ کی سند دے دی ہے لیکن میرے جاننے والوں کا خیال ہے کہ اب بھی مجھ میں جنون کے کچھ اثرات باقی ہیں۔ کاش یہی ہوتا! لیکن یہ تو واقعہ ہے اور سنگین ترین واقعہ۔ میں اس کو یاد کرتا ہوں تو میرے کلیجے میں ہوکیں اٹھنے لگتی ہیں۔

میں نے اس سے پہلے پاگل خانہ میں بھی اپنی سرگزشت لکھ ڈالنے کا ارادہ کیا مگر چونکہ اب تک واقعات کا صحیح علم خود مجھ کو نہ تھا اس لئے نہ لکھ سکا۔ تقریباً ایک ہفتہ ہوا کہ وہ مجھے مسلسل معلوم ہوئے ہیں اور میری سرگزشت اب آپ کے سامنے ہے۔

میں گھر کا خوش حال ہوں، انٹرنس تک انگریزی تعلیم پائی ہے، عربی

میں بھی کچھ شُد بُد ہے، بچپن سے میری صحت خراب رہتی ہے۔ اس لئے سلسلۂ تعلیم کو آگے نہ بڑھا سکا، ماں باپ نے اسکول سے نام کٹوا کر گانوں پر بٹھا دیا، میں اپنی جائداد کے انتظام میں لگ گیا اور اس میں شک نہیں کہ کھیت کھلیان کی آب ہوا میرے لئے بہت بڑی حد تک صحت بخش ثابت ہوئی۔ دن بھر میں ضروری کاموں میں لگا رہتا تھا اور رات کو قصے کہانی جی بہلانے کے لئے پڑھا کرتا تھا، یا کبھی کبھی شعر کہا کرتا تھا۔ شعر کیا کہتا دو مصرع موزوں کر لیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے کسی خاص علمی استعداد کی ضرورت نہیں، صرف ذوق کافی ہے۔

شام کو میں روز جنگل اور دریا کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو گرمی کے زمانہ میں تقریباً پانچ بجے میں حسب معمول گھر سے نکلا اور دریا کی طرف چلا جو میرے گانوں سے کوئی دو میل کے فاصلہ پر ہے، میں اونچے نیچے راستہ کو طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، میں کسی خیال میں محو تھا۔ شاید کوئی شعر موزوں کر رہا تھا، مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ میں کہاں ہوں، دریا کے کنارے پہونچکر مجھے ہوش آیا اور میں نے دیکھا کہ سامنے دریا کے کنارے کنارے راہیوں کا ایک گروہ چلا آ رہا ہے، مجھے یاد پڑا کہ میلے کا دن ہے، میلہ یہاں سے تین کوس اُتّر پورب اس دریا کے کنارے ہر سال ہوا کرتا ہے، اور دُور دُور سے دیہاتی آ کر اس میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ راہیوں کا یہ گروہ جب قریب آیا تو میری نظر ایک سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی پر پڑی جو سب سے آگے آگے چل رہی تھی۔ میں اس میں محو ہو گیا اور جب تک اُس کو دیکھ سکا دیکھتا رہا اور پھر دیر تک خلا میں اُس طرف دیکھتا رہا جس طرف وہ گئی تھی۔ آپ اس سے میری از خود رفتگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ میری ساری ہستی کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئی ہے، اُس نے بھی مُڑ مُڑ کر کئی بار مجھ کو دیکھا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بہوت نگاہوں کی داد دے رہی تھی۔ میں نے اس کے خیال کو دور کرنے کی بہت کوشش کی،

لیکن جتنا ہی اس کو بھولنا چاہتا تھا اُتنا ہی وہ اور یاد آتی تھی، اُس کی یاد میرے لیئے نام خدا ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے اُس کو بہت تلاش کیا مگر اُس کا پتہ نہ چلا، رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہوئی کہ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہی میری نظر کے سامنے رہتی۔ میں دن دوپہر بیداری کی حالت میں اُس کے خواب دیکھنے لگا۔

اب میں شام کو روز دریا کی طرف جانے لگا۔ میرے لیئے اب کہیں اور دلچسپی نہ تھی۔ میں اُسی جگہ جا کر گھنٹوں اُس کو یاد کیا کرتا جہاں اُس سے میری آنکھیں دو چار ہوئی تھیں۔ میری نگاہوں میں اس جگہ کو ایک خاص حرمت حاصل تھی۔

اس طرح کوئی پندرہ دن گزر گئے، میرے جنون میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی۔ میں اس مقدس "منزل" پر دیر تک سکوت کے عالم میں عشق کی نماز ادا کیا کرتا تھا۔ ایک روز حسب معمول اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا، سورج ایک سرخ گولہ بن کر مغربی افق تک پہنچ گیا تھا، دریا کی روانی میں سستی پیدا ہو چلی تھی، موجیں تھک گئی تھیں، مجھ پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری تھی، یکایک میں نے دیکھا کہ وہ پھر آرہی ہے، اس دفعہ وہ تنہا تھی اور اُس طرف سے آرہی تھی جدھر اُس دن میں نے اس کو جاتے دیکھا تھا، میرے اندر جذبات کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور میں بے ساختہ اُس کی طرف دوڑ پڑا اور پھر؟.......... پھر کچھ نہ تھا۔ وہ وہاں نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا کی بے شمار موجوں میں کہیں غائب ہو گئی ہے۔ میں یہ ماننے کے لیئے تیار نہ تھا کہ یہ سب میرے حواس کا دھوکا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ مجھ سے چند قدم پر میرے بائیں طرف گیروا لباس پہنے ہوئے ایک سادھو کھڑا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی سادھو ہے جو یہاں سے چند بیگھوں کے فاصلے پر ایک نہایت اونچے ٹیلے پر کٹی بنائے ہوئے ہے۔ یہ ٹیلہ اتنا بلند ہے کہ باڑھ کے زمانہ میں بھی جبکہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اس کا

آدھے سے زیادہ حصہ سطح آب سے اوپر ہوتا ہے۔ سادھو دن رات اسی کُٹی میں رہتا تھا۔ اور کہیں آتا جاتا نہ تھا۔ وہ گردو نواح میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ لوگ اس کو نقد اور غلہ لا کر دے جاتے تھے اور شاید اسی پر اُس کی گزر اوقات تھی، میں نے اُس کا نام سُنا تھا، میرے لئے اُس میں کوئی خاص قابل توجہ بات نہ تھی۔

میرا ہیجان کچھ ایسا بڑھا ہوا تھا کہ میں نے سادھو کو دیکھتے ہی گستاخانہ لہجہ میں پوچھا "کیوں؟ وہ کہاں گئی؟" سادھو نے کہا "بچہ! تم کس کو پوچھتے ہو؟ یہاں تو میرے سوا دیر سے کوئی نہیں ہے" یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں اپنے سوال کو شاید اور درشتی کے ساتھ دُہراتا، مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب و غریب کیفیت تھی جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، میری آنکھیں جھک گئیں، میں اپنے سر میں ایک غیر معمولی تکان محسوس کرنے لگا اور اسی جگہ بیٹھ گیا۔ سادھو نے میرے پاس آ کر پوچھا "بچہ! تم کو کیا ہوا ہے؟ میں روز تم کو یہاں بے خبری کے عالم میں دیکھتا ہوں، آخر تمہیں اس جگہ سے کیوں اُنس ہے؟ آج تم دوڑے ہوئے کہاں جا رہے تھے؟ اور یہ کس کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟" میں اب اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ میں نے سر نیچے کئے ہوئے جواب دیا:۔ "مہاراج اپنا راستہ لو مجھے کچھ نہیں ہوا ہے"

"ہوا تو تم کو بہت کچھ ہے اور مجھے خوب معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے لیکن میں خود تمہاری زبان سے تمہارا حال سننا چاہتا ہوں، دیکھو مجھے اپنا دوست سمجھو مجھ سے دل کی بات نہ چھپاؤ، میں تمہارے کام آ سکتا ہوں"

سادھو یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جس سے میرے دماغ میں سکون پیدا ہونے لگا۔ میں بات کی بات میں اس خواہش سے مغلوب ہو گیا کہ سادھو کو اپنے راز سے آگاہ کر دوں۔

میں نے اپنا مفصل حال بیان کر دیا اور میرے دل کا بار بہت کچھ ہلکا

ہو گیا۔ میں نے اُس لڑکی کا حلیہ بھی بیان کر دیا، سادھو اپنی گھنی اور لمبی داڑھی اپنے ہاتھ میں لے کر کچھ سوچنے لگا۔ میں اُس کی صورت کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی صورت سے ایک خاص جلال ٹپکتا تھا۔ یہی جلال تھا جس نے مجھے اس کے سامنے ایسا بے بس کر دیا تھا کہ میں اپنا رازدار بنانے کے لئے مجبور ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد سادھو نے ایک گہری سانس لی معلوم ہوتا تھا کہ اس ایک سانس میں نہ جانے کتنے راز پوشیدہ ہیں۔ میں اب اس سے موانست محسوس کر رہا تھا۔ میں سراپا گوش بن کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کار اُس نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ اس کا اس دنیا میں کہیں وجود نہیں، اور وہ تمہارے خواب کی رہنے والی ہے۔ اور تم درآصل اس کو خواب ہی میں دیکھا کرتے ہو تو تم میری بات کو تسلیم نہیں کرو گے اور شاید مجھ سے چڑھ بھی جاؤ۔ لیکن ادھر دیکھو! تمہاری عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس کی ہوگی، میں تم سے تیس سال بڑا ہوں۔ کم سے کم اتنا تو مان ہی لوگے کہ زندگی اور زندگی کے واقعات کا تجربہ مجھ کو زیادہ ہے۔ میں جو کچھ سمجھتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا امکان تم جو کچھ سمجھتے ہو یا کہتے ہو اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے خواب کی پری ہے۔ اور تم اگر اُس کو پا سکتے ہو تو خواب ہی کی دنیا میں۔ یہاں اس بات کو بھی سمجھ لو کہ دوسروں کی طرح میں خواب کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا۔ خواب بھی اسی طرح ایک حقیقت ہے جس طرح ہماری ہوش و حواس کی زندگی لیکن دونوں حقیقتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس دنیا کی حقیقت خواب کی دنیا کے لئے ایک واہمہ ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح خواب کی حقیقت اس دنیا کے لئے ایک دھوکا ہے، تم اگر چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں، اگر تم اس دنیا سے قطع نظر کرنا گوارا کرو تو میں ہمیشہ کے لئے تم کو اس سے ملا دوں۔"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا، میں چپ چاپ اس کا منہ تکتا رہا، اُس نے پھر کہنا شروع کیا :- "تم کو میری باتوں کا اعتبار نہیں آتا - اچھا کم از کم مجھ کو ایک ہفتہ کا موقع دو، گھر والوں سے کچھ بہانہ کر کے چپکے سے میری کٹی میں چلے آؤ اور ایک ہفتہ یہاں رہو - ایک ہفتہ کے لئے وہ تمہاری ہوگی - اُس وقت تم کو معلوم ہو جائیگا کہ میں نے جو کچھ کہا وہ کہاں تک سچ ہے - پھر اگر تم کہوگے تو مدت العمر کے لئے میں تم کو اس سے ملا دونگا - بولو! منظور ہے ؟"

میں نے بغیر سوچے سمجھے کہدیا "ہاں منظور ہے" اس کے بعد سادھو مجھ کو لے کر اپنی کٹی میں گیا اور وہاں تھوڑی دیر تک مجھے ایسے کمالات دکھاتا رہا کہ میرے ہوش اُڑ گئے، چونکہ اُن کو میری داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے اُن کو بیان کرنا بے کار ہے، دنیا اُن کو شعبدہ بازی سمجھے گی، مگر میں اُن کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا اس کے بعد سادھو نے مجھ کو رخصت کیا، چلتے چلتے اُس نے کہا :- "لیکن قبل اس کے کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو میں تم کو دو باتیں بتا دینا چاہتا ہوں - ایک تو یہ کہ تم کو اس تجربہ کے لئے اپنے کو صدق دل اور عقیدت مندی کے ساتھ میرے حوالے کر دینا پڑے گا - دوسرے یہ کہ ساتویں دن کے بعد جب تم ہوش میں آؤ گے تو تمہاری زندگی خطرے میں ہوگی - کل ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کر کے آنا"

میں اب کیا سوچتا سمجھتا ؟ میں تو بُری طرح اُس سادھو کے قبضہ میں تھا - اور اس "خواب کی پری" سے ملنے کے لئے بیتاب تھا -

دوسرے روز از سر نو ارادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی - سادھو کا خیال مجھ پر مسلط رہا کہ صبح سے شام کرنا میرے لئے پہاڑ ہو گیا - خدا خدا کر کے شام ہوئی اور ماں سے یہ کہکر کہ "میں ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں اور ایک ہفتہ وہاں رہوں گا" چل کھڑا ہوا، میرے ساتھ سوا ایک دری اور چادر کے کچھ نہ تھا - میں نے

اپنے ساتھ کسی ملازم کو نہیں لیا اور اکیلا اسٹیشن کی طرف چلا جب کچھ دور نکل گیا اور یہ اطمینان ہوا کہ اب کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو سادھو کی کٹیا کی طرف مڑا۔

سادھو مجھے دیکھ کر اُسی طرح مسکراتا ہوا اُٹھا اور مجھے اپنی کٹیا کے اندر لے گیا۔ ہرچند کہ اس وقت اُدھر سے کسی کے گزرنے کا اندیشہ نہ تھا پھر بھی سادھو نے کہا "بہتر ہے کہ ہم لوگ باہر نہ رہیں تاکہ تمہیں یہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔" اس کے بعد وہ مختلف قسم کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ زندگی کی نت نئی حقیقتوں پر اس کو پورا عبور حاصل ہے۔ مجھے اس دو دن کے اندر یقین ہو گیا تھا کہ زندگی اور فطرت کے اسرار کتابوں میں نہیں مل سکتے وہ انسان کے اندر موجود ہیں، انسان کا کام اُن کو پا لینا ہے۔

جب آٹھ بج گئے اور اندھیرا کافی ہو چلا تو سادھو نے ایک بار مجھ سے پوچھا "ہاں تو تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے؟"

میں نے کہا "مہاراج تم اپنا عمل شروع کرو میں تیار ہوں" سادھو نے کچھ پھل اور ایک پیالہ دودھ رکھ کر کہا "اچھا اس کو کھا لو، یہ ساتوک کھانا ہے۔ یہ انسان کو ہلکا اور لطیف بناتا ہے۔ آج اگر تم اس سے بھاری غذا کھاؤ تو تمہارے حق میں مفید نہ ثابت ہو گی۔" مجھے دودھ سے نفرت تھی، لیکن میں نے کھایا اور نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کیسی لذت ملی۔ اس کے بعد سادھو نے اپنا عمل شروع کیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا، رہ رہ کر وہ اپنے ہاتھ کو میرے جسم سے کوئی ایک ہاتھ کے فاصلہ پرلے جاتا تھا اور زیر لب کچھ کہتا بھی جاتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ ہوا میں تیر رہا ہوں اور پھر ....!

پرمیا اب میری تھی۔ میں نے اُس کے لئے گھر تج دیا تھا، سارے کنبے سے منہ موڑ لیا تھا اور خوش تھا، میں اپنی پچھلی زندگی کو بھول گیا تھا۔ پرمیا نے مجھے تندرست،

جوان، اور خوبصورت بنا دیا تھا، اُس نے میرے لیے کیا کچھ ایثار نہیں کیا تھا، اُس نے میرے لئے اپنی ذات پات اور دھرم کو چھوڑ دیا۔ محبت اب ہم دونوں کا دھرم تھا، ہم لوگ ایسی جگہ تھے جو اس جگہ سے بہت ملتی جُلتی تھی جہاں میں نے پہلی بار اس کو دیکھا تھا۔ لیکن اب وہ اس دنیا کی سرزمین نہیں معلوم ہوتی تھی جس میں میں اس سے پہلے رہتا تھا۔ یہاں مذہب و ملت کا جھگڑا نہ تھا۔ زمین و آسمان کی بلائیں اس جگہ نہیں پہونچ سکتی تھیں، ہم دو کے علاوہ تیسرے کا یہاں کوئی دخل نہ تھا۔ میں یہاں کا راجہ تھا اور پرمیا میری رانی، میں اس سرزمین کو پریم نگر کہوں گا، پریم نگر سدا بہار ملک تھا، یا یوں کہو کہ وہاں کی خزاں میں بھی ایک نشاط، ایک مستی، ایک طراوت تھی۔ پریم نگر میں جس طرف نظر اُٹھتی تھی نت نئے پھول اور رنگ برنگ کے سرسبز اور شاداب درخت اور پودے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں کے ندی نالوں کی موسیقی میں ایک فردوسی کیفیت تھی جس کو میں نے کبھی اس دُنیا میں محسوس نہیں کیا، پریم نگر کی راتیں ڈراؤنی نہیں تھیں، بلکہ ان میں بھی ایک دل کشا تنوپر تھی وہاں محبت سے کبھی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی اور نہ کسی چیز سے جی اکتاتا تھا جیسا کہ اس دنیا کا قاعدہ ہے اور میری پرمیا پہلے سے زیادہ حسین تھی۔ اس میں ایک لاہوتی دلنوازی آگئی تھی۔ وہ اب عورت نہ تھی بلکہ ایک دیوی تھی۔ شاعروں نے جتنے سراپا لکھے ہیں، مصوروں نے جتنی تصویریں کھینچی ہیں، سنگتراشوں نے جتنے مجسمے بنائے ہیں، دنیا والوں نے جتنی دل فریب صورتیں دیکھی ہیں اُن میں سے حسین ترین خصوصیات کو الگ کر لیجئے اور یہ سب کچھ اور ان سے بھی زیادہ میری پرمیا میں موجود تھیں۔ اس کی آنکھیں غیر فانی وفا و محبت سے معمور تھیں۔

پرمیا ہر وقت میری خدمت میں لگی رہتی تھی اور میں اس کی ہر احتیاج

سے آزاد اور ہر فکر سے بے خبر ایک دوسرے کے لئے راحت و مسرت کے نئے نئے پہلو نکالا کرتے تھے۔ میں دن رات اُس کو دیکھا کرتا تھا اور وہ مجھ کو، میری جان اُس کی آنکھوں میں تھی اور اس کی جان میری آنکھوں میں، میں اُس کے نام کی سانس لیتا تھا وہ میرے نام کی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی "پیارے! نہ جانے کتنی عمریں میں یہاں تمہارے انتظار میں گزار چکی ہوں۔ میں تمہارے لئے بنائی گئی تھی مجھے یقین تھا کہ تم مجھ کو کبھی نہ کبھی ضرور ملوگے، آخر کار میں تم کو پاگئی۔ اب تم میرے ہو اور میں تمہاری، اور یہ زمین و آسمان، چاند و سورج دن، رات جنگل، جھاڑی، ندی نالے، غرضکہ تمام چیزیں ہماری ہیں۔" اور میں جواب دیتا۔ "پریما! ہاں اب میں ہوں اور تم اور یہ کائنات، نہ تم مجھ سے جدا ہوگی نہ میں تم سے، اور نہ ہم اس دنیا کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے۔"

پریما جس وقت میرے جسم کو چھوتی یا مجھے چومتی تو اُس سے میرے دل کی رگوں میں ہیجان نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ میری روح اور روح کی ایک ایک تہ میں ایک لطیف لہر دوڑ جاتی تھی اور میں اس میں ایک سکون و راحت کی کیفیت پاتا تھا۔

میں جس دنیا کو پیچھے چھوڑ آیا تھا اس کی آلودگیوں، اس کی تاریکیوں اور اس کی مصیبتوں کی ایک ہلکی سی یاد باقی تھی۔ بعض اوقات بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک بار میں پھر اُسی دنیا میں پہونچ جاؤں اور دُنیا والوں کو محبت اور شاعری کا پیغام سناؤں۔

"دیکھو انسانیت اس کو کہتے ہیں، زندگی یہ ہے، تمہارے افکار و آلام، تمہارے بے معنی جھگڑوں، بکھیڑوں اور تمہاری گندگیوں کا نام زندگی نہیں ہے۔ جس کو تم انسانیت سمجھے ہوئے ہو، جس کو تم زندگی کہتے ہو وہ ایک قسم کی بیماری ہے، ہاں وہ ایک روحانی کوڑھ ہے۔"

کبھی کبھی مجھ پر اس پیغمبری کا جنون اس طرح سوار ہو جاتا تھا کہ میں اپنی موجودہ زندگی کی راحتوں کو چھوڑ دینے کے لئے بھی تیار ہو جاتا تھا۔ مجھے حسرت تھی کہ دنیا کو

پریم نگر بنادوں۔ پریم نگر میں اگر کبھی میرے اندر کوئی تمنا پیدا ہوئی تو یہ، اور کبھی کوئی فکر محسوس ہوئی تو یہ، لیکن میری یہ حالت بھی دیرپا نہ ہوتی تھی۔ پریما مجھے فکر مند دیکھ کر محبت میں بہلا لیتی، وہ کہتی "میرے سرتاج! پریم نگر بھی کڑھانے کی جگہ نہیں ہے، بے کار فکر نہ کرو، تم دُنیا کو جیسا بنانا چاہتے ہو وہ ہو کے رہے گی، یہ فتنے فساد، یہ بھی جھگڑے، یہ گندگیاں رہنے کی نہیں، لیکن ہر بات کے لئے ایک وقت ہوتا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ دنیا اندھیرے کو چھوڑ کر اُجالے کی طرف آئے"

اِس کے بعد پریما مجھے پریم نگر کی بے شمار رنگینیوں کی طرف متوجہ کرکے کہتی:۔

"دیکھو! چاند کی مدھم کرنیں کیا کہہ رہی ہیں، سنو! یہ قمریاں کیا کہتی جارہی ہیں۔ ادھر دیکھو! ہنس کا جوڑا بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ سامنے دیکھو! بھونرے نے پھول کے کان میں کچھ کہا، ذرا ندی کے گیت سنو اور ان لہروں کو دیکھو! کنارے کی طرف کیسا خوش خوش اور تیزی کے ساتھ آتی ہیں اور کنارے سے مل کر کھو جاتی ہیں، اور پھر ذرا اس طرف نظر اُٹھاؤ زمین اور آسمان گلے مل رہے ہیں"

یہ کہہ کر وہ میرے گلے میں باہیں ڈال دیتی اور مجھے دے کر کہنے لگتی "ہاں پیارے! محبت ہر چیز کی اصلیت ہے، محبت قدرت کی روح ہے، محبت آدمیت کی جان ہے، محبت نہ ہو تو ہر چیز بالمیہ ہے۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو زندگی ایک قسم کا کوڑھ ہے، محبت کی فتح ضروری ہے، جس دنیا کے لئے تم ابھی اپنا دل دکھاتے رہے ہو اس پر وہ ایک نہ ایک دن فتح پائے گی، اور وہ دنیا بھی ایک دن پریم نگر ہو جائے گی"

اس طرح میرے خیال میں نہ جانے کتنی مدت گزر گئی، ہماری زندگی کی مسرتوں میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ہم اسی طرح چہکتے رہے۔ لیکن ایک دن جبکہ ہم دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے موجوں سے کھیل رہے تھے پریما یکایک سہم کر مجھ سے لپٹ گئی اور ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ میں نے دیکھا تو اس طرف ہیبت ناک اندھیرا چھایا ہوا تھا جو تیزی

کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ آندھی آ رہی ہے۔ پریم نگر کے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی، میں بھی گھبرا گیا۔

آندھی خاک اُڑاتی ہوئی بہت قریب آ گئی اور میں نے دیکھا کہ ایک ڈاکو تلوار سُونتے ہوئے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ پریما کو الگ کر کے اس ڈاکو کو روکوں۔ لیکن پریما مجھ سے اور بھی لپٹ گئی، دیکھتے دیکھتے ڈاکو کی تلوار پریما کے سینے میں تھی۔ اور پریما زمین پر، مجھے اپنی غضبناکی میں پریما کا بھی خیال نہیں رہا، میں ڈاکو پر جھپٹا۔ لیکن ڈاکو مجھ سے زیادہ قوی تھا، اُس نے میری گرفت سے نکل کر ایک وار مجھ پر کیا اور میں......!

اب میرے سامنے کچھ نہ تھا، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سادھو بیٹھا میرے منہ پر پنکھا جھل رہا ہے، اُس نے پھر اُسی طرح مسکرا کر کہا "اٹھو تمہارے خواب کی میعاد پوری ہو گئی، کہو کیسی سیر تھی؟" اب میں اچھی طرح اپنے ہوش میں تھا، میں نے کہا "مہاراج! میں ہمیشہ اسی سیر میں رہنا چاہتا ہوں" سادھو نے جواب دیا "ابھی نہیں، جس خطرہ کا ذکر میں نے کیا تھا اُس سے تم محفوظ نہیں ہو۔ اس سے بچ لینا تو زیادہ کی ہوس کرنا" یہ کہہ کر وہ پھر مسکرایا اور کہا "اچھا اب گھر کا راستہ لو"

میں اسی خواب کی لذت میں محو چلا جا رہا تھا کہ میرے کانوں میں یہ آواز پڑی "نہ جانے بیچاری کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے چونک کر دیکھا تو دو راہی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں تقریباً ڈھائی کوس کے بعد ایک گانوں ہے وہاں ایک نوجوان خوبصورت عورت رات قتل ہوئی ہے، اُس کے شوہر نے قاتل کو پکڑ لیا تھا۔ مگر وہ پھر اس کی گرفت سے نکل گیا، شوہر قاتل کو پہچانتا ہے۔ اس کا خیال ہے اُس نے پہلے بھی کہیں اُس کو

دیکھا ہے۔ پولیس تلاش کر رہی ہے مگر قاتل کا ابھی تک پتہ نہیں۔ امید ہے کہ وہ جلد پکڑ لیا جائیگا اس لئے کہ اتنی دیر میں وہ کہیں دور نہیں گیا ہوگا۔"

نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اُس گانوں کا پتہ پوچھا، راہیوں نے کہا "جدھر سے آپ آرہے ہیں اُسی طرف ذرا پچھم دب کر سیدھے چلے جایئے کوئی ڈھائی کوس کے بعد وہ گانوں آپ کو خود مل جائے گا، اس لئے کہ سارے گانوں میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ میرے پانوں خود بخود اُس سمت کو اُٹھ گئے۔

اُس گانوں میں پہنچتے پہنچتے دوپہر ہوگئی، ابھی سرحد سے باہر ہی تھا کہ دو سپاہیوں نے مجھ کو غور سے دیکھا اور حراست میں لے لیا، قاتل کا حلیہ مجھ سے ملتا تھا، میں کشاں کشاں بیچ گانوں میں تھانے دار کے سامنے لایا گیا۔ میں حیرت زدہ سب کا منہ تک رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص مجنونانہ بھیڑ کو پھاڑتا ہوا میری طرف بڑھا اور کہنے لگا "ہاں یہی ہے" اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

تھانے دار نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟" اب میری نظر لاش پر پڑی اور میرے حواس بجا نہ رہے، یہ تو پریما تھی۔ اس کی صورت بالکل ویسی ہی تھی جیسی رات تک پریم نگر میں تھی اور اُس کے سینے پر اسی جگہ زخم تھا جہاں رات اُس ڈاکو نے تلوار ماری تھی۔ میں بے اختیار لاش سے لپٹ گیا اور رو رو کر کہنے لگا "یہ تو میری پریما ہے۔ اس کو تو رات اُس ڈاکو نے مارا ہے۔"

پریما کا شوہر یہ کہتا ہوا میری طرف لپکا "مکار! اب آیا ہے باتیں بنانے تاکہ لوگ تجھ کو بے گناہ سمجھیں۔" اگر لوگ اس کو پکڑ نہ لیتے تو نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ وہ مجھ پر بالکل اسی طرح جھپٹا تھا جس طرح رات میں ڈاکو پہ جھپٹا تھا۔ میرے حواس پھر درست ہوگئے اور اب میں نے کہا "یہ سب اس بدمعاش

سادھو کا کیا ہوا ہے جو اس کٹی میں رہتا ہے۔ پریما کا قاتل وہی ہے۔" اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ بیان کر دیا، اس پر سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

تھانے دار نے کہا "یا تو قتل کے احساس سے اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ یا پھر اس کو مکاری خوب آتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اس سادھو کو طلب کرایا۔

سادھو سے لوگ اچھی طرح واقف تھے اور اس کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے اس کے آتے ہی سب اس کے قدم لینے لگے۔ تھانے دار نے بھی اس کو اپنی بغل میں ایک مونڈھے پر بٹھلایا۔ سادھو نے مجھے دیکھتے ہی کہا "بچہ! میں کہتا تھا تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے، میں تم سے روز کہتا تھا کہ اس جگہ آکر نہ بیٹھا کرو، تم نے نہیں سنا آخر کار اپنے کو اس نوبت کو پہنچا یا۔"

سامنے ایک ڈنڈا پڑا ہوا تھا، میں نے اس کو اٹھا کر چاہا کہ سادھو کا سر پاش پاش کر دوں، مگر سپاہیوں نے مجھ کو پکڑ لیا۔ سادھو مسکرایا اور تھانے دار اور دوسروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "یہ میری کٹی کے پاس روز دریا کے کنارے شام کو آکر پہروں دم بخود بیٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو وہاں آنے سے بارہا منع کیا، لیکن انہوں نے میرا کہنا نہیں مانا۔ ایک ہفتہ سے یہ نظر نہیں آتے تھے۔ آج ان کو اس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔" اس پر پریما کے شوہر نے اچھل کر کہا "بس بس ٹھیک ہے میں نے بھی اس کو پہلی دفعہ اسی دریا کے کنارے دیکھا تھا جبکہ ہم لوگ شام کے وقت میلہ سے لوٹ رہے تھے۔" اب مجھ سے کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ سادھو کی افترا پردازی پر میں حیران رہ گیا۔ سادھو نے پھر کہا "میری کٹی سے کچھ دور پر ایک گانوں ہے وہ وہیں کے زمیندار کے لڑکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر انہوں نے اس لڑکی کو قتل کیا ہے تو

ہوش وحواس کی حالت میں نہیں۔"

میں حوالات میں تھا اور میرے گھر رونا پیٹنا پڑا تھا۔ خواب کو حقیقت کی ضد بتایا جاتا ہے، میں غور کرتا تھا تو دونوں اضافی چیزیں معلوم ہوتی تھیں، مجھے سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا اور اس سات روز کا خواب ایک ناقابل انکار حقیقت۔ میرے گھر والے میرے مقدمہ میں ٹھیکری کی طرح روپے پھینک رہے تھے۔ وکلا اپنا سارا زور صرف کر رہے تھے، آخر کار بڑی مشکل سے مجھے پاگل ثابت کیا جا سکا۔ میرے گواہوں میں سادھو بھی تھا، سادھو نے مجھے فاتر العقل ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں سادھو کو کچا چبا جاؤں۔

حوالات سے چھوٹا تو پاگل خانے میں جھونک دیا گیا اور وہاں چھ سال رہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے عجیب وغریب واقعات نے اور پھر پاگل خانے کی فضا نے مجھے اب واقعی پاگل بنا دیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہاں سے نجات ملی اور میں پاگل خانے سے نکل کر اپنے گھر آیا۔ کاش! میں سچ مچ پاگل ہوتا۔ کون جانے پاگلوں کا دماغ کتنا صحیح ہوتا ہے اور ان کی دُنیا عقل والوں کی دُنیا کے مقابلہ میں حقیقت سے کس قدر زیادہ قریب ہوتی ہے۔

مجھے گھر آئے ہوئے کوئی پندرہ دن ہوئے ہوں گے، گھر والے اب تک خوشیاں منا رہے تھے، منتیں پوری کی جا رہی تھیں، خیراتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ دور دور سے میرے چاہنے والے مجھے دیکھنے آ رہے تھے اور میں ایک عجوبہ روزگار بنا بیٹھا تھا، ایک روز شام کے وقت میں نے دیکھا کہ وہی سادھو اسی لباس میں اور اسی آن بان کے ساتھ چلا آ رہا ہے، گزشتہ خوفناک واقعات جن کو میں بھولنے کی کوشش کر رہا تھا ایک ایک کر کے دفعتاً میرے سامنے ہو گئے اور میرے بدن میں شعلے بھڑکنے لگے۔ سادھو کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔

میں نے ارادہ کرلیا کہ ابھی اس "آدم روابلیس" کی پوری خبر لوں گا۔ لیکن آپ سوچئے میں کیا اور میرا ارادہ کیا، سادھو قریب آیا تو اس کی مسکراہٹ اور اس کی نگاہوں نے پھر میرے اندر ایک سکون کی کیفیت پیدا کردی اور میرا غصہ بہت بڑی حد تک خود بخود ٹھنڈا ہوگیا، میں نے اُس کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں سادھو نے کہا" میں اب تک اس لئے نہیں آیا کہ تم اچھی طرح آرام کرلو تب آؤں میں تم کو دیکھنے اور تم سے ایک نہایت ضروری بات کہنے آیا ہوں۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا" بس خیریت اسی میں ہے کہ تم میرے سامنے سے فوراً چلے جاؤ، میں نے تمہاری ضروری بات بہت سنی۔"

سادھو نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔" بچہ! خیریت تو ہر حال میں ہے اور میں تم کو وہ بات سُنا کر جاؤں گا، تم نہ سنوگے تو در و دیوار کو سنا جاؤں گا۔"

یہ کچھ اس لہجہ میں کہا گیا کہ میں پھر بے قابو ہوگیا اور پتھر کی مورت کی طرح سادھو کی بات کا انتظار کرنے لگا۔ سادھو نے مشکل سے اتنا کہا تھا" پریما کا قاتل میں ہوں" کہ میں پھر پیچ و تاب کھانے لگا۔ میں نے کہا" بدمعاش! میں نہ جانتا تھا کہ تو ہی قاتل ہے۔ ٹھہر میں ابھی تجھ کو گرفتار کراتا ہوں۔" یہ کہکر میں نے چاہا کہ کسی کو آواز دوں مگر سادھو نے یہ کہکر میری زبان بند کردی" بے کار بے عقلی کی باتیں نہ کرو، مجھے قاتل کوئی نہیں کہے گا اور تم کو لوگ پھر پاگل سمجھنے لگیں گے اس کے بعد اُس نے جو سرگزشت بیان کی وہ یہ ہے:-

"میں قوم کا چھتری ہوں، میرا نام ہرنام سنگھ ہے، میں اُسی گانوں کا رہنے والا ہوں جہاں پریما رہتی تھی۔ پریما کی ماں میری بیوی تھی، میں شادی سے پہلے بھی اُس کی محبت کرتا تھا۔ اسی محبت کی بنا پر میں نے اس سے شادی بھی کی اُس کے لئے گھر بار چھوڑا، اپنے پرائے ہوئے پریما کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ پریما

بھی مجھے جی جان سے چاہتی تھی، آہ! اب یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں پہچانتا کہ میں وہی ہرنام سنگھ ہوں۔ ہاں تو عرصہ تک ہماری محبت دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی۔ میں ساری دنیا کو پربھا میں بھولا ہوا تھا۔ لیکن آخرکار وہ دن بھی آ گیا جبکہ میں نے محسوس کیا کہ پربھا میری طرف سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بے نیازی روز بروز بڑھتی گئی۔ میں اپنی داستان کو طوالت نہ دوں گا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ہمارے گانوں کے زمیندار ٹھاکر سنگھ کو پربھا سے تعلق ہے۔ پہلے تو میں نے اس کو غلط سمجھنا چاہا۔ لیکن واقعہ واقعہ رہا۔ میرا خون کھولنے لگا، میں پربھا کو مار ڈالنے کی فکر میں تھا، پربھا کو شبہ ہو گیا، اُس نے ٹھاکر سنگھ کو آگاہ کر دیا، ٹھاکر سنگھ نے اب اس کو کھلم کھلا اپنے مکان میں رکھ لیا، میں نے قانون سے مدد مانگی مگر عدالت اُس کے لئے ہے جس کو عدالت کی ضرورت نہیں۔ قانون اُسی کی مدد کرتا ہے جو قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، ٹھاکر سنگھ ایک بارسوخ زمیندار اور بڑا روپے والا تھا۔ میں ایک مفلس و نادار کاشتکار، میری شنوائی نہیں ہوئی۔ پربھا ٹھاکر سنگھ کے گھر رہی۔ میں اس صدمہ کی تاب نہ لا سکا اور اپنا مُنھ کالا کر کے یہاں سے نکل گیا۔"

"یہ اب سے چھبیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے دنیا تج دی اور سادھو ہو کر سادھوؤں کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔ انھیں سادھوؤں کے ساتھ میں ان کمالات کا ماہر ہوا جن کا مشاہدہ تھوڑا بہت تم کر چکے ہو۔ میں لوگوں کے دل کی باتیں جان سکتا ہوں، دوسروں کو ان کے ارادہ سے باز رکھ سکتا ہوں اور سب سے بڑا کمال وہ ہے جس نے اس معاملہ میں میری مدد کی۔ یعنی میں دوسرے کے قالب میں داخل ہو سکتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ پر بھروسہ کر کے اپنے کو سپرد کر دے۔ اب میں نے قسم کھائی کہ میں پربھا اور ٹھاکر سنگھ سے انتقام لوں گا۔ اور اس کے لئے

جتنے کمالات اس درمیان میں حاصل کئے ہیں سب کام میں لاؤں گا۔ میں اس نیت سے پھر یہاں آیا مگر مجھے معلوم ہوا کہ پربھا اور ٹھاکر سنگھ دونوں مرچکے ہیں اور ٹھاکر سنگھ سے پربھا کی ایک لڑکی ہے جس کو ٹھاکر سنگھ کے گھر والوں نے نکال باہر کیا ہے اور اس کی شادی ہو چکی ہے، میں نے اُس لڑکی کو دیکھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ماں کی طرح اس میں بھی بے وفائی ہے، میں نے قسم کھائی کہ اپنا بدلہ اس لڑکی سے لوں گا۔ یہ تمہاری پریما تھی۔ سال بھر تک مجھے کوئی ایسا نہ ملا جس کو اپنا آلہ بناتا۔ آخر کار مجھے موزوں ترین شخص ملا۔ یعنی تم۔ میں نے اپنا قالب تم کو دیا اور تمہارا قالب خود لیکر اُس کو قتل کر آیا۔ اُس کے شوہر نے مجھے پکڑ لیا تھا مگر میں بھاگ نکلا۔ میں نے سات دن بعد اُس کو اس لئے قتل کیا کہ تم اتنے دنوں تک اُس سے لطف اندوز ہو لو، قتل کے ساتھ تمہارا ہوش میں آجانا یقینی تھا۔"

"مجھے بیچ میں نہ ٹوکو، میں خود تمہارے ہر سوال کا جواب دے دوں گا۔ یہ دُنیا ہی جھوٹ سے آباد ہے۔ یہ کچھ تمہارا پریم نگر تو ہے نہیں، پھر اگر میں نے جھوٹ سے ایک فساد برپا کیا تو کیا ہے مجھے معلوم ہے کہ تم پریما کو چاہتے ہو۔ مگر بچہ اس سے اس دُنیا میں ملنا ٹھیک نہ تھا، وہ یہاں ایک مٹی ہوئی محبت کی یادگار تھی، اُس سے پریم نگری میں ملنا تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہے۔"

"میں اپنا وعدہ پورا کرنے یہاں آیا ہوں۔ کہو تو ہمیشہ کے لئے تم کو تمہاری پریما سے ملا دوں لیکن تمہارے گھر والوں اور خود تمہارے لئے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ تم ہر مہینے ایک ہفتے کے لئے اُس سے ملا کرو۔ آئندہ سے ایسا ہی ہوگا، پریم نگر اور اس دنیا کا برابر مقابلہ کرتے رہو گے تو اس سے کم از کم یہ فائدہ ہوگا کہ اس دنیا میں اُس کی آلائشوں اور بُرائیوں سے بہت کچھ بچتے رہو گے۔ اب مجھے تم سے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ میں جاتا ہوں۔ اب مجھے اپنی ذات سے انتقام لینا ہے۔" سادھو

بغیر مجھ سے رخصت ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور چل دیا۔ میں سکتے کے عالم میں دیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔

صبح کے وقت ایک شور تھا کہ ہرنام سنگھ نامی جوان جو برسوں سے غائب تھا آج اُس کی لاش سادھو کی کُٹی کے سامنے ملی ہے۔ موت خنجر کے ایک زخم سے واقع ہوئی تھی جو عین اُسی جگہ تھا جہاں اُس زن پریما کے سینہ پر دیکھا گیا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی افواہ تھی کہ سادھو کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لوگوں کو سادھو پر طرح طرح کے شبہے تھے۔ میں بھی ندی کے کنارے پہونچا تو دیکھا کہ نہ وہ سادھو ہے نہ سادھو کا جلال، ایک نہایت معمولی داڑھی منڈا شخص زمین پر مُردہ پڑا تھا اور لوگوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ بعضوں نے مجھ سے سادھو کے متعلق سوالات کرنا شروع کئے۔ میں وہاں سے گھبرا کر بھاگ نکلا۔

سادھو مجھے جو برکت دے گیا تھا وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ میں ہر مہینہ ایک ہفتہ کے لئے پریم نگر چلا جاتا ہوں اور وہاں پریما کے ساتھ اسی طرح بلاؤں سے محفوظ زندگی بسر کرتا ہوں، اب پریم نگر کا مطلع کبھی غبار آلود نہیں ہوتا۔ اب ہاں آندھیاں نہیں آتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے پریم نگر اور پریما کا ہو جاؤں مگر شاید میرے حق میں بقول اُس سادھو کے وہاں مہینہ میں ایک ہی ہفتہ رہنا بہتر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہر مہینہ ایک ہفتہ کے لئے مجھ پر خواب کا دورا پڑا کرتا ہے اور میں چوبیں گھنٹہ بے حس و حرکت پڑا سویا کرتا ہوں۔ ڈاکٹروں نے اس کو ایک قسم کی بیماری بتایا ہے پہلے تو انہوں نے اس بیماری کا نام بہت بڑا اور بھیانک بتایا تھا، شاید "ٹری پینوسومیاسس" (TRYPANOSOMIASIS) یا اسی طرح کا کوئی نام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مرض ایک قسم کے جراثیم سے پیدا ہوتا ہے جو دماغ میں گھس جاتے ہیں۔ یہ مرض مہلک ہوتا ہے۔

اب جبکہ دو سال سے یہ مرض بدستور قائم ہے اور میں مرا نہیں تو انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور اب "نعاس" (SOMNULEUCE) یعنی معمولی خواب کی بیماری تشخیص کی۔ میں خود اس کو ایک مقدس راز سمجھتا ہوں اور اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا:۔

"زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری است"

(سنہ ۱۹۲۹ء)

تم میرے ہو

بوقتِ زندگانی چاک زد ہر کس گریبانے
بعہدِ مرگ نتواند قرار اندر کفن گیرد

(نظیری)

تم میرے ہو

میں جو واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں وہ الٰہ آباد کی اُس عمارت سے متعلق ہیں جو لب جمنا واقع ہے اور "احسان منزل" کے نام سے مشہور ہے۔ واقعات ایسے ہیں جو آسانی سے سب کی سمجھ میں نہیں آسکتے اور میں سمجھانے کی فضول کوشش بھی نہیں کروں گا، کیونکہ دُنیا میں بہتیری باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی توجیہ ناممکن ہوا کرتی ہے۔ اِس کے علاوہ ہر موقع پر نظریۂ تعلیل کی رو سے بحث کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی نگاہ سطحی ہے اور وہ صغرے، کبرے کی بندشوں سے آزاد ہونا نہیں چاہتا ہے اور جو لوگ ہر بات کی تاویل کرنے لگتے ہیں اُن کو میں کم نظر اور تنگ خیال سمجھتا ہوں

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے اور نہ میں واہمہ پرست ہوں جیسا کہ اکثر ناظرین کو شبہہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نفسیات کا ماہر سمجھا جاتا ہوں۔ میں نے قوائے انسانی اور اُن کے افعال کا پورا مطالعہ کیا ہے۔ میں فلسفہ اور منطق کی تکمیل کر چکا ہوں، یہی نہیں بلکہ سیکڑوں کو ان علوم میں سبق دے چکا ہوں، یعنی مدتوں سے پروفیسری کر رہا ہوں، البتہ میں کبھی صرف علمی اصطلاحوں میں نہیں اُلجھا، میں جانتا ہوں کہ انسان کا علم محدود ہونے کے علاوہ اضافی اور اعتباری ہے۔ حقیقت عقل کے ذریعہ معلوم نہیں کی جا سکتی ہے، صرف دل کے توسط سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ:۔

من ز قشر آں برگزیدم مغز را — استخواں پیش سگاں انداختم

میں نے "احسان منزل" اس لئے کرائے پر لی تھی کہ یہ عمارت ایسی جگہ ہے جہاں انسان بلاکسی کی مداخلت کے سکون کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے، اور میں ایسی ہی پر سکون جگہ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈاکٹری کی ڈگری لینے کے لئے اپنی کتاب تیار کرنی تھی۔

مرزا احسان علی صاحب جن کا یہ مکان تھا الہ آباد کے ایک سربرآوردہ رئیس اور ممتاز وکیل تھے۔ وہ قرب وجوار میں آزاد خیال مشہور تھے، اُن کی آزاد خیالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی اکلوتی لڑکی کو اُردو، فارسی، اور عربی کے علاوہ انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی دلوائی تھی، الٰہ آباد میں گھر گھر اسی کا چرچا تھا، لڑکی کی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن قدرت کا کارخانہ ہی نرالا ہوتا ہے۔ شادی کو پانچ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ بیچاری نہ جانے کس مرض میں مبتلا ہو کر دُنیا سے چل بسی۔ والدین کے لئے یہ ایسا دھکا نہ تھا جس کی وہ تاب لا سکتے، اُن کی دُنیا تاریک ہو گئی "احسان منزل" جو واقعی فردوس کا ایک نمونہ تھی اُن کے لئے دوزخ ہو گئی۔ انسان سکون حاصل کرنے کے لئے نئی نئی تدبیریں سوچتا ہے۔ چنانچہ احسان علی صاحب مع اپنی بیوی کے حج کو چلے گئے جس کا اس سے بیشتر اُن کو کبھی خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔

"احسان منزل" یوں تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے کم کی عمارت نہ تھی۔ لیکن احسان علی صاحب کی تاکید تھی کہ اس کے صرف پچاس روپیہ کرایہ لئے جائیں۔ اور وہ بھی یتیموں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ مکان نہایت وسیع اور شاندار تھا۔ اُس کے چار کمروں میں احسان علی صاحب کے سارے سامان مقفل تھے اُس پر بھی مکان میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک پورا خاندان آرام سے رہ سکتا تھا۔

"احسان منزل" میں مجھے آئے ہوئے پانچ چھ روز ہو گئے تھے، اس دوران

میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ ایک ہی کمرے میں صرف کیا تھا، ابھی تک دوسرے کمروں کی وضع و قطع پر غور کرنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی- ایک دن کا ذکر ہے کہ شام کو کالج سے واپس آیا، میرے ساتھ دو تین احباب بھی تھے، میں نے خدمتگار سے کہا کہ آج چائے دوسرے کمرے میں پی جائے گی- یہ کمرہ اُس کمرے کی پشت پر تھا- جس میں مَیں رہا کرتا تھا-

خدمت گار نے چائے لاکر میز پر لگا دی اور ہم لوگ چائے کے ساتھ چند اہم مسائل بھی حل کرنے لگے، اتنے میں میرے ایک دوست نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے؟"- میری نگاہیں بھی اُٹھ گئیں- دیکھا تو ایک بیس برس کی عورت وقار نسائیت کا مجسمہ بنی ہوئی بیٹھی ہے، اُس کی آنکھوں میں ایک مسحور کرنے والی متانت تھی- اس کے تیور بتلا رہے تھے کہ یہ عورت دنیا میں صرف مٹنے اور مٹانے آئی تھی- اب تک حُسن کے مفہوم سے میں ناآشنا تھا، میں کسی عورت کی سحر آفرینیوں سے مغلوب نہیں ہوا تھا، لیکن اس تصویر میں نہ جانے کون سی قوت تھی کہ اپنے احباب کے چلے جانے کے بعد گھنٹوں اُس کو دیکھتا رہا اور وہاں سے کسی طرح ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا- میں سمجھ گیا کہ یہ احسان علی صاحب کی لڑکی کی تصویر ہے- جس کی جدائی کے صدمہ نے اُن کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا-

دوسرے دن میں آٹھ بجے رات تک باہر رہا، موسم سرما کا آغاز تھا- چاندنی رات تھی، لوٹتے وقت "احسان منزل" تک تو مجھے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی- میں برگساں کے مسئلہ "عقل و بداہت" میں محو تھا جس نے دنیائے فلسفہ میں ایک نیا موضوع پیدا کر رکھا ہے، مگر احاطہ میں داخل ہوتے ہی ایک ناقابل بیان اندرونی تحریک سے میری نظر باغ کے اُس گوشے کی طرف اُٹھ گئی جو مکان کے داہنی جانب تھا اور جہاں آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی- میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی

جب میں نے دیکھا کہ ایک عورت ساری میں ملبوس کھڑی ہے اور اُس کے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھے ہوئے ہیں۔ میں جلدی سے برآمدے میں اسی جانب آ گیا تاکہ اس کو قریب سے دیکھ سکوں۔ کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا اور اگر بتاؤں تو اُس کو مانتا کون کافر ہے۔ میں اُس عورت کو ایک نگاہ میں پہچان گیا احسان علی صاحب کی لڑکی جس کی تصویر میں کل میں کھو گیا تھا آج اپنے خاکی پیکر میں میرے سامنے تھی۔ اُس میں اور اس کی تصویر میں سرِ مو فرق نہیں تھا۔ وہی سن، وہی صورت، وہی رعنائی، گویا اتنے زمانے کے امتداد کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میرے پڑھنے والے اس کو التباس حواس کہکر ٹال دیں گے لیکن مجھ کو اپنے حواس کا بہتر علم ہے اور میں اپنے حواس پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ میں اس منظر سے گھبرایا نہیں، مجھے محسوس ہونے لگا کہ قریب اور دور کی ہر چیز پر ایک نیا اور انوکھا رنگ چڑھ گیا ہے۔ مگر میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اپنے ہاتھ کس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے اور کیوں۔ یہ چاندنی دیوی زیر لب کچھ کہتی بھی جاتی تھی جس کو میں صاف سُن نہ سکا۔ کچھ دیر تک تو برآمدے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ آخر کار ضبط نہ کر سکا اور نیچے اُتر کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ دور ہٹ گئی۔ میں آگے بڑھتا گیا اور وہ پیچھے ہٹتی گئی، یہاں تک کہ وہ مکان کے عقب میں ہو گئی اور اب جو میں نے اُدھر آکر دیکھا تو اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ پھر میں نے "احسان منزل" کے چاروں طرف گشت لگایا۔ مگر مجھے وہ عورت نہ دکھلائی دی۔ میں حیران تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ کوئی خواب یا واہمہ نہ تھا بلکہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی اصلیت پوشیدہ تھی، تقریباً ایک گھنٹہ سرگرداں رہنے کے بعد میں اپنے کمرے میں یہ کہتا ہوا چلا آیا کہ "ہنوز چشمش نگراں است کہ ملکش باد گراں است"

خدمتگار کمرے میں میرا انتظار کر رہا تھا، میں نے فوراً کھانا لانے کا حکم دیا۔

کھانے کے بعد میں نے خدمتگار کو خلافِ معمول وقت سے پہلے رخصت کر دیا۔ چلتے وقت اُس نے کہا "حضور! مجھے ایک بات کہنی ہے، اکثر باغ میں اور کبھی کبھی مکان کے اندر بھی کسی کی آہٹ ملتی ہے۔ اور بعض دفعہ تو درختوں کے سایہ میں مجھے کوئی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ نہ جانے کیا بلا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حضور اس مکان کو چھوڑ دیں، مجھے تو بڑا ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "یہ سب تمہارا خیال ہے اس وہم کو اپنے دل سے دور کر دو، ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" نوکر کو تو میں نے جاہل اور بے وقوف بنا دیا مگر میں خود کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ نوکر نے چند جملے کہکر میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا تھا یعنی جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ میری نظر کا دھوکا نہ تھا۔

ساڑھے دس بج چکے تھے آج مطالعہ میں میرا جی نہیں لگتا تھا میں گزشتہ واقعہ پر تبصرہ کر رہا تھا اور کسی طرح کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر غیر مانوس قدموں کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار اُٹھ کر کمرے سے باہر گیا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آج مجھے کچھ خلش سی تھی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔

گھڑی نے گیارہ بجائے۔ یکایک تصویر والے کمرہ میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے اپنا پستول لیا اور کمرہ کا دروازہ کھول کر برقی قمقمہ روشن کر دیا میں نے دیکھا کہ ایک نحیف الجثہ شخص کھدر کی میلی دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے سامنے کھڑا ہے۔ وہ مجھے اور میرے پستول کو خاموشی کے ساتھ عجیب بے معنی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اس دوران میں مجھے پورا موقع مل گیا کہ اُسے غور سے دیکھ سکوں۔ یہ آدمی صورت سے مریض معلوم ہوتا تھا اور آنکھوں سے دیوانہ۔ اُس کے جسم میں ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی آفت رسیدہ شخص ہے اور کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ یہ سوچ کر میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔

اور اُس سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"چور یا ڈاکو کے سوا جو سمجھئے" اُس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن باہر کے کمرے کا دروازہ تو بند تھا تم یہاں کیسے آئے؟"

"کھڑکی ذرا سی جنبش سے کھل جاتی ہے۔ میں یہ جانتا تھا" اُس نے کہا۔

"یہاں آئے کس غرض سے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور تصویر کی طرف اشارہ کر کے "یہ مجھ سے نہ پوچھئے اس سے پوچھئے"

یہ کہہ کر وہ بے ساختہ رونے لگا مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے پھر دریافت کیا "تم کو اس سے کیا تعلق ہے؟"

"قبل اس کے کہ میں آپ کو اپنی پوری داستان سناؤں آپ میرے ہمدرد بننے کا وعدہ کیجئے، آپ فلسفی سمجھے جاتے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ میرے ساتھ تمسخر نہ کریں اور اس سے بڑھ کر میرے جذبات کی توہین نہیں ہو سکتی، میں آپ کی ہنسی کی تاب نہ لا سکوں گا، میں ایک مٹا ہوا آدمی ہوں، میرے پاس سوا اپنے جذبات کے اور کچھ نہیں ہے جس پر میں ناز کر سکوں، یہی میری دنیا ہے، یہی میری دولت ہے"

وہ ایک سانس میں اتنا کہہ گیا اور اب اُس کا دم پھولنے لگا، وہ کمزور تھا، اُس کے لب و لہجہ سے ایک طنز آمیز سنجیدگی ٹپک رہی تھی مجھے اس کے ساتھ خود ہی ہمدردی ہو گئی تھی، میں نے خلوص دل سے وعدہ کیا کہ اُس کے جذبات کا احترام کروں گا۔ وہ بدستور رو رہا تھا۔ اُس کے جسم میں لرزہ تھا، نہ جانے کیوں بار بار میرے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ شخص گھڑیوں کا مہمان ہے میں کسی جدید انکشاف کا منتظر تھا۔ لیکن اس کا رونا کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں لال

ہو رہی تھیں، دم الٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا، یہ وہ سماں تھا کہ مجھ جیسے بطی الحس آدمی سے بھی نہ رہا گیا، میں نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "آخر کچھ بتاؤ تو اس طرح سے رو رو کر کیوں جان کھو رہے ہو؟" اُس کے جسم کو چھونے سے معلوم ہوا کہ اس کو شدید تپ چڑھی ہوئی ہے، اور وہ اسی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا "تم کو بخار چڑھا ہوا ہے اور تم کوئی کپڑا نہیں پہنے ہو، تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں اپنا کمبل لیتا آؤں۔"

"انصاری صاحب!" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

"تم کو میرا نام کس نے بتایا؟" میں نے بات کاٹ کر تعجب سے دریافت کیا۔

"یہیں کسی سے معلوم ہوا کہ اس مکان میں جہاں میرے نفس کی تہذیب و ترتیب ہوئی ہے پروفیسر انصاری صاحب رہتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ فضول زحمتیں نہ گوارا کیجئے۔ میں کرتے اور دھوتی کے سوا اپنے بدن پر کوئی اور کپڑا نہیں ڈالتا، مدت سے یوں ہی بسر کر رہا ہوں۔ میں نے سعی بسیار کے بعد اپنے کو اس طرز معاشرت کا خوگر بنایا ہے اور مجھے اسی میں سکون ملتا ہے، البتہ اگر ایک بوتل شراب مل جائے تو میں اپنی سرگزشت بیان کرنے کے قابل ہو جاؤں۔"

مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔ میں نے نوکر کو شراب لانے کے لئے فوراً اسٹیشن بھیجا اور خود چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے تیور چڑھا کر کہا "تم میرے مکان میں بلا اجازت داخل ہو گئے اس کی سزا میں تم کو کمبل بھی اُڑھاؤں گا اور چائے بھی پلاؤں گا۔" وہ پھر کچھ نہ بولا اور اپنی آنسو بھری آنکھوں سے تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مجنونانہ انداز سے اُٹھا اور تصویر کو اُتار لایا، اب اُس کی وہ حالت تھی جسے صرف ہذیان یا خفقان کہہ سکتے ہیں۔ اس نے تصویر کو سینہ سے اس زور سے لپٹایا کہ گویا اپنی پسلیوں کو توڑ کر اس کو اندر رکھ لینا چاہتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے مرض کی اصلیت کیا ہے۔ مگر تفصیل سے

ناواقف تھا، اس کی مضطربانہ حرکتوں سے خود بے قابو ہو چلا تھا، چائے تیار ہو چکی تھی۔ میں نے اس کو ایک پیالی دی اور کہا "ذرا ضبط سے کام لو، اس طرح بے قابو ہونا شیوۂ مردانگی سے دور ہے"

میرے اِن جملوں نے اس کو بدمزہ کر دیا، اُس نے تصویر سامنے رکھ دی اور ایک مصنوعی مگر نہایت تلخ مسکراہٹ سے یہ شعر پڑھا ؎

"حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نہ زاہد بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن"

پھر کہنے لگا "انصاری صاحب! میں جانتا تھا کہ آپ مجھے مغلوب الاعصاب سمجھ کر میری ہنسی اُڑائیں گے۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں اس لئے ناصح کا کام شاید آپ کو زیب دیتا ہے، لیکن میری صلاح یہ ہے کہ کبھی کبھی آپ فلسفہ سے بے نیاز ہو کر زندگی کے راز پر غور کیا کیجیے۔

"اے آنکہ دائم عاقلی دیوانہ یک دم نیز شو"

عقل تو انسان کے لئے ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس میں صلاحیت ہی نہیں کہ زندگی کے سنجیدہ اور اہم مسائل کو سمجھ سکے، ذرا جذبات کی دنیا میں آیئے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے، اُس وقت نہ صرف مظاہر و حوادث آپ کی سمجھ میں آجائیں گے بلکہ آپ اس طلسم کدہ سے واقف ہو جائیں گے جس کو افلاطون "عالمِ مثال" کہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے بھی فلسفہ میں ایم، اے کیا ہے اور اس کے بعد علمی دُنیا میں وہ وقار حاصل کیا جو ہر شخص کی قسمت میں نہیں آتا۔ بڑے بڑے لوگوں میں اپنی جودتِ طبع اور زبان و قلم کے زور سے ممتاز رہ چکا ہوں، میں آپ کو بتا دیتا اور آپ تسلیم کر لیتے کہ زندگی کا اصل راز کیا ہے اور شیوۂ مردانگی کس کو کہتے ہیں، لیکن اب نہ وہ دل نہ دماغ رہا نہ وہ حوصلہ۔

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ۔۔۔ الا حدیث دوست کہ تکرار میکنم

آپ میرا نام جاننے کے لئے بیتاب ہیں؟۔ شاید آپ بھی مجھے جانتے ہوں میرا نام جمیل ہے جس نے اُردو صحافت میں ایک نئی روح پھونکی، جو فسانہ نویسی میں آپ اپنی نظیر ہے، جو فن تنقید کا پیشوا مانا جاتا ہے"

"کیا تم وہی جمیل ہو جو احسان علی صاحب کے اخبار "نقیب الملت" کا ایڈیٹر تھا اور جو انگریزی زبان کے بہترین مقرروں میں گنا جاتا ہے؟"

"جی ہاں وہی جمیل!" اُس نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔ "آپ کو میرا وہ خطاب نہیں معلوم جس پر میری خاک کے ذرّوں کو بھی ناز رہے گا، یعنی (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) سائرہ کا مبتلا" یہ کہہ کر اُس نے تصویر پھر اٹھالی اور پاگلوں کی طرح اُس کو چوم کر سینہ سے لگا لیا۔ میں ششدر رہا۔ اس لئے کہ جمیل کا نام سنکر مرعوب ہو گیا تھا، جس نے آج تک مباحثوں اور مناظروں میں کسی سے شکست نہیں کھائی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اشعار پڑھ پڑھ کر مجھ کو احمق بنا دے گا۔ اس وقت اس کی "حدیثِ دوست" کے سامنے کوئی منطق ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے، اس پر بھی اس کے جوشِ تکلم کا یہ عالم تھا کہ کم از کم میں تو اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں خاموش اُس کی زندگی کے حالات سُننے کا منتظر تھا۔ اُس نے چائے ختم کی اور مجھ سے ایک سگریٹ لیکر پینے لگا۔

اتنے میں شراب بھی آگئی۔ میں نے شیشہ کے گلاس میں ڈھال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا "میں شرابی نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی اپنی قوتوں کو اکٹھا کرنے کے لئے پی لیتا ہوں، لوگ خود فراموشی کے لئے شراب پیتے ہیں اور میں اپنے کو یاد کرنے کے لئے۔ اگر آج نہ پیوں تو آپ مجھ سے کچھ نہ سن سکیں گے"

جمیل کے آخری جملوں نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ اُس نے جلدی سے پورا گلاس خالی

کردیا اور کُرتے کے دامن سے مُنہ پوچھ کر اپنا الم نامہ بیان کرنا شروع کردیا :-

" (تصویر کی طرف پھر اشارہ کرکے) اب تو غالباً آپ اسقدر سمجھ گئے ہوں گے کہ " یہ احسان علی صاحب کی لڑکی سائرہ ہے - یعنی میری " معبود " لفظ " معبود " سے آپ مجھے کو بدذوق اور یاوہ گو تصور کریں گے لیکن یقین مانئے میں اس ہستی کو کسی اور لقب سے یاد ہی نہیں کرسکتا - وہ میری بیوی نہ تھی اور نہ میری کوئی غرض اُس سے وابستہ تھی، تاہم میں سائرہ کا پرستار تھا - اُس کے سامنے مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوجاتی تھی جسے " حیرانی " یا " انفعالیت " کہہ سکتے ہیں - اُس کو دیکھ کر میرے جذبات عبودیت برانگیختہ ہوجاتے تھے، میرے اندر ایک ہلچل مچ جاتی تھی - اور بیساختہ جی چاہتا تھا کہ سر بسجود ہوجاؤں - پھر بتایئے کہ سائرہ کو معبود نہ کہوں تو کیا کہوں ؟ "

جمیل دم لینے کے لئے رُک گیا، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں یا کروں میں تو اس کی حالت کو ایک عصبی دورہ سمجھ رہا تھا، اگر اپنی رائے اُس پر ظاہر کرتا تو نہایت آسانی سے ثابت کردیتا کہ اس سے زیادہ سمجھنے کی مجھ میں قابلیت ہی نہیں - اس ڈر سے میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا، جمیل نے پھر سلسلہ شروع کیا :-

احسان علی صاحب میرے چچا ہیں، میرے والد بیس برس کی عمر میں گھر سے خفا ہوکر حیدرآباد چلے گئے تھے اور چونکہ ارادہ کے پکے تھے انھوں نے پھر کبھی وطن کا رُخ نہیں کیا - وہ حیدرآباد میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور ہوگئے اور وہیں شادی کرکے بس گئے - میں وہیں پیدا ہوا اور انٹرنس تک تعلیم پانے کے بعد علی گڈھ بھیجدیا گیا، وہاں میں ہمیشہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا - فلسفہ، سیاسیات اور ادبیات میں میرے اُستاد مجھ سے رائے لیا کرتے تھے - ہندوستان کے انگریزی اور اُردو رسائل میں مضامین لکھ کر میں نے ایام طالب علمی ہی میں کافی نمود

حاصل کرلی تھی۔ ایم، اے کرنے کے بعد ایک مقتدر روزنامہ کی ادارت مجھے مل گئی۔ جس کے لئے ڈیڑھ سو روپے ماہوار مجھے دیئے جاتے تھے، والد چاہتے تھے کہ مجھے بھی کسی بلند عہدے پر مامور کرادیں، لیکن میرے فطری میلان سے مجبور ہو گئے اخبار کی ایڈیٹری نے میری شہرت کو پر لگا دیئے اور دنیائے صحافت میں میں صائب الرائے مان لیا گیا۔ فطرت اپنا کام پورا کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھ لیا کرتی ہے میری ماں مجھے دس برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اخبار کی ایڈیٹری کرتے ہوئے سال ہی بھر ہوا تھا کہ والد بیمار پڑے اور مجھے چھٹی لیکر حیدر آباد جانا پڑا، مرض رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہو گیا کہ وہ وقت آگیا ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ ٹالے نہیں ٹلتا، اطبا ہاتھ پاؤں مارتے رہ گئے اور والد جینے کی اُمید موہوم لئے ہوئے اس دنیا سے چل بسے۔ احسان علی صاحب اور دیگر اعزہ تعزیت کے لئے پہونچے، اور یہیں سے میری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

احسان علی صاحب نے والد کی وفات کے کچھ دنوں بعد سخت اصرار کیا کہ اب میں اُن کے ساتھ رہوں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں کہیں ملازمت کروں اُنھوں نے نہایت پیار کے لہجہ میں کہا "خدا کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے، تم اور سائرہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرسکتے ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ کسب معاش کے لئے در بدر پھرتے رہو۔ تم کو "نقیب الملت" کے ہوتے ہوئے کسی اور اخبار کی ایڈیٹری کرنے سے یوں بھی عار ہونا چاہئے۔ الہ آباد چلو اور وہیں بیٹھے بیٹھے کتابیں بھی تصنیف کرو اور "نقیب الملت" کو بھی اپنے ہاتھ میں لو۔"

اُن کے ایک ایک لفظ سے خلوص نیت کا پتہ چلتا تھا اور یہ ایسا جادو ہوتا ہے جو آن کی آن میں قلب ماہیت کرسکتا ہے۔ ظاہر میں کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ ملازمت ترک کرکے احسان علی صاحب کے ساتھ ہولیتا۔ لیکن انھوں نے کچھ اس انداز سے

مجھے یہ سب کچھ کہا کہ میرے حیدرآبادی اقربا کی کچھ نہ چلنے پائی اور میں از سرِ نو زندگی شروع کرنے کے لئے الٰہ آباد جانے پر آمادہ ہو گیا۔"

جمیل کا ہیجان آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، اس کی سانس گھٹنے لگی جس کی وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ وہ ایک ہی لمحہ میں اپنی ساری داستان بیان کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا، اس لئے کہ اس کے دل میں ایک تلاطم تھا۔ اس کی ایک ایک رگ میں قیامت برپا تھی۔ وہ جسقدر جلد مجھے اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اسی قدر اُس کو دیر ہو رہی تھی اور اس کا افسانہ طویل ہوتا جاتا تھا۔ جمیل تھوڑی دیر اِدھر اُدھر وحشیانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد ایک گلاس شراب اور پی کر سلسلہ شروع کیا:۔

"احسان علی صاحب کو واقعی مجھ سے بے انتہا محبت تھی اور گھر کے دوسرے افراد بھی مجھے وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، الٰہ آباد میں میری قابلیت اور طباعی پہلے سے مشہور تھی، اہل مذاق مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ اب جو میں یہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے ملا تو اُن کے حلقہ میں میری شخصیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ مختصر یہ کہ ہر شخص مجھ سے مرعوب تھا، لیکن میں خود جس ہستی سے مرعوب ہو گیا وہ سائرہ تھی۔ (تصویر کو مخاطب کر کے) آہ! سائرہ!"

"تو جلوہ دادی و مدہوش کردۂ مارا"

یہی سائرہ جس کو آپ اس وقت میری گود میں دیکھ رہے ہیں، اب سائرہ میری ہے۔"

آخری جملہ اس لہجہ میں کہا گیا تھا جو پتھر کو موم کر سکتا تھا۔ میں خود متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا دل دُکھ گیا۔ میں نے جمیل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اپنے ساتھ اتنا ظلم نہ کرو، تم نہ جانے دنیا میں کیا ہوتے۔ مگر دیکھو تو تم نے اپنے کو کیا کر ڈالا......"

"نصیحت کی ضرورت نہیں، مجھ کو مخلصانہ ہمدردی کی ضرورت ہے۔ انصاری صاحب! اگر آپ میری داستان سے بے کیف ہو رہے ہیں تو میں یہیں ختم کر کے آپ سے معذرت مانگ لوں۔ لیکن اب مجھے صلاح نیک سے ممنون کرنے کی کوشش نہ کیجیے، میں متحمل نہیں ہو سکتا۔" اُس نے چڑ کر جواب دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنی بربادی کو "خوش آمدید" کہہ رہا ہے۔ میں نے کہا معاف کرو، مجھ سے غلطی ہوئی، تم اپنے حالات سناؤ، مجھے تم سے لگاؤ ہو گیا ہے۔"

اُس نے اپنے تیور درست کر کے پھر شروع کیا۔

"یوں تو حیدر آباد میں احسان علی صاحب کے منہ سے سائرہ کا نام سنتے ہی میرے کانوں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ فضا میں ایک لطیف ارتعاش پیدا ہو گیا ہے مگر اس کو میں نے اپنی لطافت مذاق پر محمول کیا تھا، کیونکہ سائرہ کا ایک تصور قائم کر لیا تھا، لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ میرے تصور کو اصلیت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ سائرہ حسین وجمیل تھی۔ ممکن ہے جس کو میں حسین وجمیل کہوں وہ آپ کی نگاہ میں کریہ المنظر اور بدہیئت ہو، اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے نقطۂ نظر سے اُس میں "کاروبار دلداری" کے تمام "نکات" موجود تھے۔ اُس میں وہ "آن" تھی جس کو حافظ "عین دلبری" سمجھتے ہیں۔ میں نے اب تک عورت اور محبت کے موضوع پر کبھی غور نہیں کیا تھا اور اس لحاظ سے اپنے کو خوش نصیب تصور کرتا تھا، مجھے یقین تھا کہ محبت جیسی غیر واضح اور مہمل چیز کبھی مجھ پر قابو نہیں پا سکتی۔ میں مطمئن تھا، لیکن آنے والا وقت مجھ پر ہنستا رہا ہو گا۔"

"سائرہ سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میں رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا کہ سائرہ غیر معمولی ہستی ہے اور صرف مجھ پر حکومت کرنے آئی ہے۔ اس شکست کا مجھ کو کبھی گمان بھی نہ تھا۔"

سائرہ کی شادی میرے آنے سے چھ ماہ پہلے ہو چکی تھی - ذرا میری بے بسی پر غور کیجئے، مجھے اپنی محبت پیش کرنے کا بھی کوئی حق نہ تھا - وہ دوسرے کے ساتھ پیمانِ رفاقت باندھ چکی تھی، اُس کی شادی ڈاکٹر ابوظفر کے ساتھ ہوئی تھی جو یہاں کے مشہور ڈاکٹر ہیں - ڈاکٹر کی دنیا "گوشت و پوست" سے آگے نہیں بڑھتی - ابوظفر کو سائرہ کے ساتھ دلچسپی ضرور تھی - لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اس کی توقعات کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے - سائرہ لطیف ترین جذبات کی عورت تھی اور ابوظفر ہر اُس چیز کو بے بنیاد اور لایعنی سمجھتے جس کو وہ اپنی جراحی کے ذریعہ سے مشاہدہ میں نہ لا سکتے ہوں - دونوں کی طبیعتوں میں خاک اور عالمِ پاک کی نسبت تھی، اُن کی زندگی ایک معاملہ ہو کر رہ گئی تھی جس کو دونوں نہایت حسن و خوبی سے نباہ رہے تھے - میں آیا تو سائرہ نے ایسا سمجھا کہ اُس کے لئے کوئی فرشتہ نازل ہو گیا ہے جو اس کی زندگی کو لطافت سے معمور کر دیگا - آہ! اس کو کیا خبر تھی کہ جس کو وہ فرشتہ رحمت سمجھ رہی ہے وہ اُس کے حق میں "تباہی کا شیطان" ثابت ہونے والا ہے"

جمیل کے ہونٹ کانپنے لگے - اور وہ تھوڑی دیر تک اس قابل نہ تھا کہ سلسلہ کو جاری رکھ سکے، کچھ تو شراب نے اور کچھ جذبات کے اُبھار نے اُس کے زرد چہرہ کو کسی قدر سُرخ بنا دیا تھا چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد اُس نے مجھ سے ایک اور سگریٹ مانگا اور اپنے حواس کو از سرِ نو مجتمع کر کے کہنا شروع کیا:-

"آپ کے لئے شاید میرے افسانہ میں کوئی دلچسپی نہ ہو، ممکن ہے آپ مجھ کو بدکردار کہیں اس لئے کہ میں نے ایک ایسی عورت سے محبت کی جو غیر کی بیوی تھی لیکن آپ اِس کو ذہن نشین کر لیجئے کہ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ "محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے"، محبت اگر دوشیزہ سے ہو سکتی ہے تو

بیاہی عورت سے بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال سائرہ سے مجھ کو محبت ہو گئی اور یہ محبت روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ میں نے اس کو مدتوں حقیقت حال سے بے خبر رکھا، مگر پرستش کی نگاہیں چھپ نہیں سکتیں، اُس کو بھی میری کیفیات قلب کا پتہ چل گیا اور وہ متفکر سی رہنے لگی۔ ابھی تک میں نے اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن نگاہوں نے تبادلۂ خیالات کر لیا تھا۔ گویا۔

"پرستش تھی اور پائے سخن درمیاں تھا"

ایک سال اِسی طرح گزر گیا۔ میں اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اسی کی صحبت میں گزارا کرتا، اس کا علمی اور ادبی ذوق میرے لئے بہانہ ہو گیا تھا۔ سائرہ کی محبت میری جولانی طبع کے لئے تازیانہ ہو گئی۔ چنانچہ اُس زمانہ میں میں نے بہترین سیاسی و اقتصادی مضامین لکھے اور چار بیش بہا کتابیں تصنیف کیں جن کی دھوم ہو گئی۔ سائرہ کتب بینی کی شیدا تھی، اس کو مجھ سے مدد ملی۔ میں اُس کو روزانہ کم سے کم چار گھنٹے پڑھایا کرتا تھا۔ جب وہ اپنی سسرال میں ہوتی جو یہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے تو میں وہاں جا کر اس کی صحبت سے کیف اندوز ہوتا، کبھی کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا، سب سمجھتے تھے کہ ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ محض ادبی لگاؤ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات مشہور ہونے لگی کہ مجھے اُس سے غیر معمولی اُنس ہے، جو ممکن ہے کوئی خطرناک صورت پکڑ لے ہمارا سکون چھن گیا، دونوں متردد رہنے لگے۔ مگر ابھی ہماری پرانی روش میں سر مو فرق نہیں آیا۔ سائرہ نے صورت حال سے تجاہل عارفانہ کیا اور میں بھی چپ رہا نہ اُس نے مجھ سے کچھ کہا اور نہ میں نے اُس سے۔ بیاہی عورت کو چاہنا عیب سمجھا جاتا ہے، دُنیا والوں کے دماغ میں محبت اور معصیت کا تصور پہلو بہ پہلو آتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ محبت کرنے والوں کا دامن کبھی آلائشوں سے پاک رہ سکتا ہے۔

"سائرہ کے ساتھ میری شیفتگی کی کوئی انتہا نہ تھی، اُس سے دور رہ کر میرا جی کسی کام میں نہ لگتا تھا، میں ہر وقت اُس سے قرب چاہتا تھا۔ یہ شیفتگی لوگوں کی نگاہ سے نہ بچ سکی۔ میں سائرہ کی ذرا سی تکلیف دور کرنے کے لئے ہر وقت اپنی جان نثار کرنے پر آمادہ رہتا۔ میں سائرہ کی محبت کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ میری نجات صرف اس لئے ہوگی کہ میں نے سائرہ کو دل و جان سے چاہا۔ ہاں تو ہماری محبت رسوا ہونے لگی۔ احسان علی صاحب مجھ سے کشیدہ ہو گئے۔ ابوظفر نے مجھ سے سرد مہری کا برتاؤ شروع کر دیا، رشتہ داروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، سائرہ کی کلفتوں کی انتہا نہ تھی، میں دلگیر رہنے لگا۔ وقت نازک ہو گیا تھا، آخرکار وہ دن بھی آ گیا جب ہم دونوں کے تکلف کا پردہ فاش ہو گیا۔ سائرہ نے میری زبان سے سُن لیا کہ میں اُس کے لئے اپنے دل میں ایک معبد تیار کر چکا ہوں اور میں جان گیا کہ سائرہ میرے جذبات سے اِس طرح متاثر ہو چکی ہے کہ اب وہ مجھ سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔"

"ایک روز کا ذکر ہے کہ سائرہ کی ساری میں سانپ لپٹ گیا۔ میں اس کے قریب کسی سوچ میں کھڑا تھا، اُس کے ہاتھ میں "کلیات نظیری" تھی، میری نظر سانپ پر جا پڑی، پھر مجھے ہوش نہیں کہ میں نے کیونکر اُس کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر پھینک دیا، بعض موقعے ہوتے ہیں جہاں صرف جذبات کی تحریک سے کام ہو سکتا ہے، سانپ کو دیکھ کر اگر میرے حواس بجا رہتے اور میں اپنی ہستی کو بھول نہ جاتا تو شاید سائرہ میری آنکھوں کے سامنے چند منٹ میں دم توڑتی ہوتی۔ میری دیوانہ وار حرکت کا علم گھر میں ہر شخص کو ہو گیا اور اشارے ہونے لگے۔ سائرہ کے کمرے میں بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ میں سیدھا باہر گیا اور گیارہ بجے رات تک "احسان منزل" میں داخل نہیں ہوا۔"

گرمی کا زمانہ تھا میں برآمدہ میں اپنے بستر پر لیٹا سائرہ کے ساتھ اپنی وابستگی پر غور کر رہا تھا۔ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کچھ دنوں بعد مجھے "احسان منزل" کو "الوداع" کہنا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ سائرہ سے علیحدہ ہو کر اب میری تمام قوتیں بیکار ہو جائیں گی، یعنی وہ میرے تمام اچھوتے خیالات اور نرالے افکار کی محرک بن چکی تھی۔ میں نے ایک خاص ہستی کو اپنے ذوقِ عبودیت کا مرکز بنا لیا تھا اور اب جو اس کی طرف سے نگاہ پھیر کر دیکھتا تو دنیا بے کیف اور تیرہ و تار نظر آتی۔ اسی کشاکش جذبات میں دو بج گئے۔ یکایک میرے کمرے میں لیمپ کی روشنی جس کو میں دھیمی کر آیا تھا تیز ہو گئی۔ میں نے چاہا اٹھ کر دیکھوں کون ہے کہ اتنے میں سائرہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور دبی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا "ذرا سن لو" اس کی آواز سے کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں پائی جاتی تھی۔ میں اس طرح اٹھا جیسے کسی نے مجھ پر سحر کر دیا ہو اور اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا، وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بغیر کسی تمہید کے مجھ سے پوچھا "آج تم سے جو اضطراری حرکت سرزد ہو گئی تھی اس کے کیا معنی تھے؟" میں اس طرز تکلم سے متحیر رہ گیا اور باوجود اس کے کہ میرے دل میں بہت کچھ تھا لیکن اس کے سنجیدہ تیور دیکھ کر تھوڑی دیر تک اپنی ساری فصاحت و بلاغت بھول گیا۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا "جواب جلد دو، ابھی نہ جانے کتنی باتیں میں جاننا چاہتی ہوں اور وقت بہت کم ہے۔"

وہ ضبط سے کام لے رہی تھی۔ ورنہ اس کے چہرے کے آثار کہہ رہے تھے کہ وہ ایک تاب شکن اور صبر آزما طوفان کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس دفعہ ہمت کر کے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا اس کے صرف اس قدر معنی تھے کہ اس دنیا کو میں تم سے خالی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔" میری زبان کھل گئی، اور مجھے یقین ہو گیا کہ آج کی رات فیصلہ کن ہو گی۔

"یعنی تم مجھ سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہو کہ اب مجھ سے علیحدہ ہو کر تمہاری زندگی بے مزہ ہو جائے گی۔" اُس کی سنجیدگی میں دکھے ہوئے دل کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی بیباکی اس بات کی دلیل تھی کہ شک وشبہ کی تاب نہیں لا سکتی اور کسی قطعی نتیجہ پر پہونچنا چاہتی ہے۔ ابھی تک وہ جس لہجہ میں بات کر رہی تھی وہ مجھے ناگوار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "سائرہ! یہ بات محسوس کرنے کی ہے پوچھنے کی نہیں۔" میں نے چند الفاظ میں اپنی روداد بیان کر دی تھی۔ اب ضبط کرنا سائرہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اُس نے بے اختیار ہو کر کہا "دیکھو جمیل! میرے خیال کو مستحکم نہ ہونے دو، میں جس چیز کو اپنا وہم سمجھنا چاہتی ہوں اس کو سنگین حقیقت بنا کر میرے سامنے نہ پیش کرو۔ قیامت برحق ہو یا نہ ہو، موت یقینی ہو یا نہ ہو لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ ہم کو ایک دوسرے سے جدا رہنا ہے، پھر اپنے لئے جیتے جی دوزخ تیار کرنا کہاں کی دانائی ہے؟"

"یہ سب مجھے معلوم تھا اور اسی وجہ سے میں نے اب تک تم سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا کہ ممکن ہے تمہاری زندگی بے کیف ہو جائے۔ مگر تم میری فکر نہ کرو، میں اپنی دوزخ کو جنت بنانا جان گیا ہوں۔ میں اس راز سے واقف ہو گیا ہوں کہ محبت کے کانٹے بھی پھول ہوا کرتے ہیں، تم سے محبت کر کے نہ جانے میں نے کیا کیا سیکھا ہے۔ سائرہ! میں بہک رہا تھا تم نے مجھے سیدھے راستے پر لگا دیا۔ جب میں سوچتا ہوں کہ سائرہ ایسی ہستی کو میں چاہتا ہوں تو میں اپنی قسمت پر گھمنڈ کرنے لگتا ہوں۔ ؎

"زاں نیازے کہ تو ہست مرا نازے ہست"

"بس! بس! اس سے زیادہ سن کر میں جی نہیں سکتی جبکہ ہمارا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ دُنیا والے اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ دو پاک روحیں آپس میں ملیں۔ میرے والد اس قدر آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی اب تمہارا میرے ساتھ

رہنا معیوب سمجھتے ہیں۔ میں رفتہ رفتہ تم کو اپنا سمجھنے لگی تھی اور میرا دل تمہاری طرف کھنچا اور اس طرح کہ پھر اسی طرف کا ہو کر رہ گیا۔ میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی، یہ کوئی گناہ نہ تھا......"

سائرہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی، اُس کی زبان رک گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ یہی ایک موقع میری زندگی میں ایسا ہوا جبکہ میں نے سائرہ کو پیار کیا، اس وقت قیود کی پابندی کے کوئی معنی نہ تھے، میں نے اُس کو بیساختہ اپنی گود میں لے لیا۔ میری آغوش میں وہ اور بھی جی کھول کر روئی۔ خود میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں مگر میں رو نہ سکا۔ جب سائرہ کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اُس نے میرے چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا "جمیل! میں کہہ نہیں سکتی کہ میں تم کو کتنا چاہتی ہوں۔ اِس عرصۂ قلیل میں میرے دل پر محبت کا وہ نقش بیٹھا ہے جو مٹائے مٹ نہیں سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ تم میرے ہو اور میں اپنے کو خوش نصیب سمجھنے لگی تھی۔ آہ! مجھے دھوکا ہو گیا تھا کہ اب تک اپنی زندگی میں جو کمی محسوس کر رہی تھی وہ پوری ہو گئی، یعنی مجھے ایک ہم مذاق رفیق مل گیا، مگر ہم ایک دوسرے سے چھینے جا رہے ہیں۔ بتاؤ تو ہم نے کون سا ایسا گناہ کیا تھا جس کی یہ سزا تجویز کی جا رہی ہے، تمہاری لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم راہ راست پر آ جاؤ۔ دیکھتے ہو جمیل! تم ابھی تک بے راہ چل رہے تھے، خدا کے لئے اس "پریشان خواب" سے چونکو اور مجھے بھول جاؤ، مجھے بھول جاؤ، اور اپنے کو سدھارو، میں تمہارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہوں۔ تم جاؤ اور دنیا کی مقبول عام زندگی بسر کرو، مجھے خود دیکھو کہ میں دوسرے کی ملکیت ہو کر رہ گئی ہوں اور تمہاری کوئی امید مجھ سے پوری نہیں ہو سکتی، پھر اپنے کو میرا مبتلا کیوں بناؤ؟"

سائرہ نے پھر رونا شروع کیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کا گھاؤ میرے گھاؤ سے

زیادہ خطرناک ہے۔ عورت کا دل یوں بھی مرد کے مقابلہ میں زخم پذیر ہوتا ہے۔ اُس کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی اور یہ اس کی پہلی محبت تھی۔ دُنیا اس کو سائرہ کی کمزوری سمجھے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہی اُس کی سب سے زبردست قوت تھی۔ بہر حال اب وہ مجھے بھول نہیں سکتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ روح فرسا صدمہ جو اس کے لئے تھا وہ یہ تھا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ دوران گفتگو میں وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ "تم میرے ہو" اور اس خیال سے وہ بے چین ہو رہی تھی کہ میں کسی اور کا بھی ہو سکتا ہوں۔ یہ افواہ میں نے بھی سنی تھی کہ احسان علی صاحب اور میرے دوسرے خیر خواہ میرے لئے "رفیقۂ زندگی" کی تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن میں اپنا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے سائرہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سائرہ! میں یوں بھی شادی نہ کرتا اس لئے کہ میں شادی کرنے والے جانوروں میں سے نہیں ہوں اور اب جبکہ تم میری زندگی کو نت نئی رنگینیوں سے معمور کرنے کے لئے مل گئی ہو تو ناممکن ہے کہ میں ان رنگینیوں میں کسی قسم کی آلودگی پیدا کروں۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا رہوں گا۔ میں تم سے دور رہ کر صرف تمہاری یاد کے سہارے جی سکتا ہوں۔ قرب و دوری یا وصال و ہجر کی اصطلاحیں میرے لئے کوئی خاص معنی نہیں رکھتیں۔ البتہ آج تم نے ایک تشویش پیدا کر دی ہے۔ اگر مجھ سے دور رہ کر میرے خیال سے اپنی زندگی کو پر کیف بنانا تم کو دُشوار معلوم ہوتا ہے تو خدا کرے تمہارا دل مجھ سے پھر جائے ورنہ برباد ہو جاؤ گی یہ نہ ہونا چاہئے۔ محبت کو جو لوگ دُکھ بنا لیتے ہیں میں اُن کو تحسین کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں عنقریب الٰہ آباد چھوڑنے والا ہوں، تم اس انقلاب کا مقابلہ کرو اور اطمینان کے ساتھ اب تک جیسی زندگی بسر کرتی رہی ہو بسر کرو۔ وعدہ کرو کہ میرے کہنے پر عمل کرو گی؟"

میں نے دیکھا سائرہ کی حالت مجھ سے زیادہ تشفی کی محتاج ہے۔ مجھے اندیشہ کیا

یقین تھا کہ میری جدائی اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ اسی لئے میں اس سکون کے ساتھ اُس سے گفتگو کر رہا تھا، ورنہ خود مجھ میں اتنی تاب نہ تھی۔ کائنات میری نظر میں بے رنگ ہو رہی تھی۔ سائرہ کو میں چھوڑ رہا تھا۔

سائرہ کو میری گفتگو سے بہت کچھ تسکین ہوئی۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "ہاں! تم میرے ہو اور میں تمہاری، دنیا کی کوئی قوت فی الحقیقت ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ خواہ ہمارے درمیان بعد المشرقین ہی کیوں نہ حائل ہو"

"ہاں بس یہ سمجھ لو اور پھر تم کو کوئی دُکھ نہ ہوگا۔ محبت تو ایک مزے کی چیز ہے۔ اس میں تلخیاں نہ پیدا کرو۔ میں ایک ہفتہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا، تم اپنا جی نہ کڑھانا، میں دنیا میں بڑے سے بڑا کام تمہارا نام لیکر اور تمہاری راہ میں کروں گا۔ بس جاؤ اور شگفتہ رہنے کی کوشش کرو" میں نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اپنا جملہ ختم کیا۔

"لیکن اس قدر جلد تم کو مجھے چھوڑ دینے کی کیا ضرورت ہے؟" سائرہ نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔

"سائرہ مجھے ثابت قدم رہنے دو۔ تم کو معلوم نہیں کہ اب ہمارا ایک جا رہنا کیا کیا بدمزگیاں پیدا کر سکتا ہے۔ محبت ایسے ماحول میں اظہار کے بعد خوفناک ہو جایا کرتی ہے۔ میں تم کو مٹانا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ لیکن اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "تم مٹاؤ یا نہ مٹاؤ میں تو مٹ چکی" میں نے اُس کو رخصت کر دیا کیونکہ چار بج چکے تھے اور خود بیٹھ کر سوچنے لگا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل و دماغ کی کیا حالت تھی۔ سائرہ کے نوید محبت سے مجھ کو بے انتہا سکون ہوا۔ مگر خود اس کی حالت مجھے بے چین کر رہی تھی۔ بہرحال تھوڑی دیر تک میں ایسی دنیا

میں تھا۔جہاں بجز میرے اور سائرہ کے کسی دوسری چیز کا وجود نہ تھا۔انصاری صاحب! معلوم ہوتا ہے اس وقت سے صدیاں گزر گئیں"۔

جمیل کے خیالات کا مرکز بدل گیا۔اور اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے اُس نے تصویر کی طرف دیکھا اور عجیب پُر اثر لہجہ میں یہ شعر پڑھا۔

شمیم مہر نہ باغ وفا نمی آید　بہر چمن کہ تو بشگفتہ، صبا خفتہ است

میں نے دیکھا اب وہ پھر بہک رہا ہے اس لئے آدھا گلاس بھر کر شراب اُس کو دی جس سے اُس کا جوش عود کر آیا اور وہ داستان کا باقی حصہ سُنانے لگا۔

"اب افسانہ زیادہ طویل نہیں ہے۔مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اس قدر زحمت دے رہا ہوں"۔

"اُس رات کے بعد میں کل دس دن الٰہ آباد میں رہا اور اس درمیان میں سائرہ سے بہت کم ملا، ورنہ اپنے ارادہ پر شاید قائم نہ رہ سکتا۔مگر اتنا مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اسکی آزردگی بڑھ رہی تھی۔احسان علی صاحب وغیرہ کو بھی خبر ہوگئی تھی کہ میں نے لاہور میں ایک انگریزی اخبار کی ایڈیٹری قبول کر لی ہے اور الٰہ آباد کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔انہوں نے رسماً مجھے روکنا چاہا۔لیکن میں بچہ نہ تھا، اُن کا بُشرہ کہہ رہا تھا "خس کم جہان پاک" آہ! اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ اُن کی "بہترین دولت" بھی اس "خس" کے بعد اُن کے پاس زیادہ دنوں تک نہ رہے گی۔

میں خود سمجھتا تھا کہ سائرہ کو زمانہ بہلائے گا۔لیکن محبت نے اُس کو پختہ مغز بنا دیا تھا۔مرد اپنی محبت کو فلسفہ، ادبیات، شاعری، صناعی اور دوسری دلچسپیوں میں بہلائے گا۔لیکن عورت ایسا نہیں کر سکتی۔وہ جب محبت کرتی ہے تو محبت ہی کی ہو کر رہ جاتی ہے، اور یہی ہوا، لاہور میں مَیں نے مختلف مصروفیتیں نکال لی

تھیں اور میرا وقت کٹ جایا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سائرہ کا خیال مجھے بےچین رکھتا تھا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کو بھولتا نہیں تھا۔ میں اخبار میں گورنمنٹ کے خلاف مقالے لکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ سائرہ ان کو پڑھ کر خوش ہو گی، میں تقریریں کرتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ سائرہ بیٹھی سُن رہی ہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کھدر پوشی اور ترک تعاون کی شورش ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل رہی تھی۔ لاہور میں مَیں اس شورش میں نمایاں حصہ لے رہا تھا۔ میں سکون واطمینان سے محروم ہو چکا تھا اور اب اس پرشور زندگی میں میری پراگندہ دلی کام آ گئی، مجھے فخر ہے کہ میں نے عوام کی صلاح و بہبود میں کافی حصّہ لیا ہے۔ سائرہ کی محبّت نے مجھے ایک کار آمد چیز بنا دیا۔ غالبؔ نے اگرچہ کفر بکا ہے تو اس شعر میں۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عشق انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ خیر!۔

سائرہ سے علیحدہ ہو کر مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں تھی۔ چنانچہ جب ایک اشتعال انگیز تقریر پر مجھ کو دو سال قید کی سزا ملی تو میں نے اس کو جنت سمجھا۔ مجھ کو اپنی ذات سے ضد ہو گئی تھی۔ میں تین سال سے اسی طرح کُرتہ اور دھوتی میں بسر کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اُس زمانہ میں سگریٹ اور شراب بہت پینے لگا تھا جس نے میری صحت خراب کر ڈالی تھی۔ ڈاکٹر کہا کرتے ہیں کہ میرے دل کی حالت اندیشہ ناک ہے۔ مگر مجھے اس کی فکر نہیں۔ قید میں میری تندرستی اور بھی خراب ہو گئی اور مجھے ہلکی حرارت رہنے لگی جو کبھی کبھی تیز بھی ہو جاتی ہے۔

اِس تین سال کے اندر میرے اور سائرہ کے درمیان کوئی خط وکتابت نہیں ہوئی تھی۔ جب میں قید سے چھوٹا تو لاہور میں مجھے ایک کارڈ ملا جس میں صرف اس قدر لکھا تھا:۔

کر چکے تم تو دشت پیمائی مجھ سے گھر بیٹھے خاک چھنوائی

نیچے دستخط کی جگہ "س" لکھا ہوا تھا۔ مجھے دھکا لگا اور اس طرح کہ پھر کبھی میں سنبھل نہ سکا۔ سائرہ کی حالت کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اس شعر نے سائرہ کی شبیہہ میرے سامنے کر دی۔ اس نے مجھے اس قابل نہ چھوڑا کہ میں یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر سکتا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ سائرہ مر رہی ہے اکثر انسان کو بلا کسی توسط کے ہونے والی بات کا علم ہو جاتا ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد مجھے ایک الہ آبادی دوست سے معلوم ہوا کہ سائرہ چار ماہ سے بیمار ہے اور حالت مایوس کن ہے۔ ڈاکٹروں نے ورم دل تشخیص کیا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ چل کر اس کے بستر مرگ پر چار آنسو گرا آؤں۔ مگر میری ہمت نہ پڑی۔ میں اپنی ذات کو اس کی تباہی کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا، میں اُس کا گنہگار تھا۔ میں خود فنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سائرہ فنا ہو گئی۔ میں سخت جان سانس لے رہا ہوں۔ سائرہ کے دل میں اس خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ میں اس کے لئے مٹ رہا ہوں اور وہ اس خیال کو مرتے دم تک نہ نکال سکی۔ ایک مہینہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ وہ اپنی مٹی کی خوابگاہ میں ہمیشہ کے لئے سو گئی ہے۔ میں اُس کو نہ دیکھ سکا۔"

جمیل پھر تصویر کو مخاطب کر کے کہنے لگا "سائرہ! دنیا کے لئے تو مر گئی ہے مگر میرے لئے زندہ ہے۔ میں تجھے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے دیکھتا ہوں اور تجھ سے اپنے جذبات کا اظہار کر لیتا ہوں۔ میں پاگل مشہور ہو گیا ہوں اس لئے کہ اب نہ کچھ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔ دنیا والوں کی اُمیدیں مجھ سے منقطع ہو گئیں تو وہ مجھے پاگل سمجھنے لگے۔ اخباروں میں چھپ گیا کہ میرا دماغ اپنے افعال متعینہ میں کوتاہی کر رہا ہے۔ لیکن تو خوب جانتی ہے کہ اصلیت کیا ہے۔ اب ایک لمحہ کے لئے تو مجھے فرصت نہیں دیتی کہ میں کوئی دوسرا کام کروں۔"

جمیل چپ ہو گیا اور سرنگوں ہو کر آنسو بہانے لگا۔ جب اُس نے سر اٹھایا تو میں نے پوچھا "اب تم کیا کرتے ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو؟"

اُس نے مجھ کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھا جس کے میں معنی نہ سمجھ سکا اور تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد جواب دیا۔ "ہاں! ابھی افسانہ کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھ سے دریافت کیا۔ میں ابھی لاہور میں اسی اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ لیکن میری ایڈیٹری برائے نام ہے۔ میں نے دس مہینے سے نہ ایک حرف لکھا ہے نہ کوئی تقریر کی ہے۔ میرے احباب جاننا چاہتے ہیں کہ مجھ میں یہ انقلاب کیوں ہوا۔ مگر اُن کو سمجھانے کی فرصت کسے۔ آج تو نہ جانے کس رَو میں میں نے آپ کے سامنے اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ آج نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائرہ مجھ سے قریب ہے۔ پانچ روز کا ذکر ہے کہ لاہور میں میں اپنے کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ مجھے سہر یعنی بے خوابی کی بیماری ہے۔ تمام رات جاگتا رہتا ہوں اور سائرہ سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ آپ اس کو سائرہ کا تصور کہیں گے۔ میں اس کو سائرہ کہتا ہوں، اور میرا ایمان ہے کہ وہ سائرہ ہے۔ اس رات کو میں نے دیکھا کہ سائرہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے ہوئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور یہ کہتی جا رہی ہے کہ "تم میرے ہو، تم میرے ہو" میں بیتابانہ اس کی طرف بڑھا۔ اور کہا "ہاں سائرہ! میں تمہارا ہوں مجھے لے چلو" مگر وہ مجھے پھر تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ دوسرے دن میرا دل الہ آباد آنے کے لئے تڑپ رہا تھا، واللہ اعلم کیوں۔ میں آج صبح کو یہاں پہونچا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں سائرہ کی قبر پر گیا تھا وہاں مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ اُس تودۂ خاک کو میں سائرہ نہیں مان سکتا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ "احسان منزل" چلنا چاہیے، جہاں کا گوشہ گوشہ سائرہ کا آئینہ دار ہوگا، جہاں کی خاک کا ذرہ ذرہ سائرہ کی مہک سے بس رہا ہوگا۔ میرا یہاں آنا

بےکار نہیں ثابت ہوا، باوجود اس کے کہ یہاں ایک اجنبی رہتا ہے مجھے یہاں بے انتہا سکون حاصل ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے پھر کروٹ بدلی ہے۔ اور اب پھر میں سائرہ کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں ....

مگر آہ! میری یہ قسمت کہاں، مجھے تو ابھی تک نہ جانے کب تک اس دنیائے گردو نما میں رہنا ہے۔ سائرہ کہاں اور میں کہاں! تاہم میرا دل کہتا ہے کہ اب مجھے زیادہ اس طرح جینا نہیں ہے، میرے پھیپھڑے داغ دار ہو چکے ہیں، دل خراب ہو چکا ہے۔ سانس باقی ہے جو میرے اور سائرہ کے درمیان ایک دیوار بنی ہوئی ہے۔ مگر ایسی حالتوں میں اس دیوار کا ٹوٹنا کوئی دشوار کام نہیں ہے"

جمیل نے اتنا کہہ کر پھر سر جھکا لیا اور اب وہ ایسی محویت کے عالم میں معلوم ہوتا تھا کہ میری موجودگی کی بھی اس کو خبر نہ تھی۔ میں اب سے چند گھنٹے پیشتر کے واقعات پر غور کر رہا تھا، مجھ کو معلوم ہو گیا کہ سائرہ یا سائرہ کی روح اُس وقت زیر لب کیا کہہ رہی تھی۔ میں علّت و معلول کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہتا تھا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ جمیل کے چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی، وہ ابھی سے بھوت معلوم ہوتا تھا، تو کیا وہ سائرہ کا بلایا ہوا یہاں آیا تھا؟۔

ساڑھے چار بج گئے تھے، رات اپنے گیسو سمیٹ رہی تھی، افق پر صباحت نمودار ہو چلی تھی۔ میں اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ جمیل چونک کر یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا:۔

"زندہ باش سائرہ! میں تو جانتا تھا کہ تو مجھ کو بلا رہی ہے۔ میں تیرے ساتھ چلنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ سائرہ! سائرہ! ارے سائرہ! تو تو ذرا بھی نہیں بدلی، جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ میں البتہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔"

میں مبہوت رہ گیا۔ ہر سمت سے "تم میرے ہو تم میرے ہو" کی صدا آ رہی تھی اور پھر میرے کمرے سے سائرہ اُسی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے اور "تم میرے ہو! تم میرے ہو!" کہتی ہوئی جمیل کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر جس طرف سے آئی تھی پھر اُسی طرف چلی گئی۔ جمیل کے مُنھ سے ایک حرف نہ نکلا۔ میں اس کے بعد بڑی دیر تک حرکت کرنے کے قابل نہ تھا، جیسے مجھ کو کسی نے مسحور کر دیا ہو۔

سُورج اپنی پوری آب و تاب سے نکل آیا۔ میں بیٹھا رات کے مشاہدات پر غور کر رہا تھا۔ میں اس کو خواب سمجھ کر ٹالنا چاہتا تھا۔ لیکن واقعات کچھ اس قدر ترتیب وار میری آنکھوں کے سامنے تھے کہ میں اُن کی حقیقت سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ اتنے میں مجھے اطلاع ملی کہ ایک شخص میرے مکان کی پشت پر جمنا کے کنارے مرا ہوا پایا گیا، اور بعد کو معلوم ہوا کہ وہ مشہور و معروف جمیل تھا جو قید کے بعد لاہور کے ایک انگریزی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔

اخباروں نے تعزیت نامے لکھے، بڑے بڑے اہل قلم نے ماتم کئے۔ میرے خیال میں جمیل کے ماتم کی بہترین صورت یہ تھی کہ اس کی زبان سے سُنی ہوئی داستان کو دہرا دوں۔ پڑھنے والے مجھ کو مخبوط الحواس سمجھیں گے اور میرا مضحکہ اُڑائیں گے، مگر محض اس خوف سے میں خدا کی خدائی سے تو انکار نہیں کر سکتا

آخر میں اتنا اور کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس دن کے بعد سے میں نے پھر سائرہ کی صورت نہیں دیکھی، بجز اُس کی تصویر کے جو ابھی تک اُس کمرے میں موجود ہے۔ میرے خدمتگار کو بھی پھر کبھی "بھوت پریت" کی شکایت نہیں ہوئی۔

سنہ ۱۹۲۷ء

سید محمد اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم و ادب دہلی نے انصاری پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔